قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوع اسلام کراچی

جلد نمبر ۸
شمارہ نمبر ۲

ہفتہ ۱۲ فروری ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس روپے

فہرست مضامین

★

لمعات ۳

★

کوائف پاکستان ۵

★

عالم اسلامی ۶

★

تاریخی شواہد ۷

★

اسلام کی سرگزشت ۸

★

مجلس اقبال ۹

★

عورت کا قرآن ۱۰

★

انڈونیشیا ۱۱

★

باب المراسلات ۱۴

★

بین الاقوامی جائزہ ۱۵

★

نقد و نظر ۱۶

★

حقائق و عبر ۱۷

قرآن نے کیا کہا

دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ انسانی معاملات کی عقدہ کشائی انسانی عقل کی رو سے کرنی چاہئے۔ اس کے علاوہ انسان کو کسی راہ نمائی کی ضرورت نہیں - یہ وہ ہیں جنہیں ''مغرب زدہ'' کہا جاتا ہے۔

دوسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی معاملات کے حل کے لئے عقل کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہئے - مذہب نے ہر بات کا فیصلہ پہلے سے کر رکھا ہے۔ ان فیصلوں کی اطاعت ہمارا فریضہ ہے۔ اس طبقہ کو ''مذہب پرست'' طبقہ کہا جاتا ہے۔

قران کہتا ہے کہ نہ پہلے طبقے کا خیال صحیح ہے اور نہ دوسرے طبقے کا۔ انسانی معاملات کے حل کے لئے وحی کی روشنی کی بھی ضرورت ہے اور عقل کی آنکھ کی بھی - وحی نے انسانی راہ نمائی کے لئے ایسے غیر متبدل اصول عطا کردیئے ہیں جنہیں انسانی عقل وضع نہیں کرسکتی تھی - انہی کو زندگی کی مستقل اقدار (یا قران کے الفاظ میں حدود اللہ) کہتے ہیں - عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل آپ دریافت کرے - یعنی ہر زمانے کے انسان وحی کے عطا کردہ اصولوں کی روشنی میں قانونی جزئیات اپنے لئے آپ متعین کریں - اس نے کہا کہ اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی وحی متعین کردے تو ان میں رد و بدل کی گنجائش نہ رہے اور اس طرح انسان زمانے کے بدلنے والے حالات کے ساتھ نہ چل سکے -

یا یہا الذین آمنو ا لا تسئلو ا عن اشیاء ان تبد لکم تسؤ کم وان تسئلوا عنھا حین ینزل القرآن تبد لکم (۵/۱۰۱) اے جماعت مومنین (اپنی طرف سے کاوشیں کرکے) ان چیزوں کے متعلق سوالات نہ کرو کہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تم پر ناگوار گزرے - اگر تم ان باتوں کے متعلق سوال کروگے جبکہ قران نازل ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ تم پر ظاہر کردی جائینگی (اور پھر تمہارے لئے مشکل ہو جائیگی) یعنی دین کے جو اصول خدا نے دینے تھے وہ قران میں دیدئے - تم ان اصولوں کی جزئیات بھی وحی کے ذریعے متعین کرانے کی کوششیں نہ کرو - اس سے تم مستقل طور پر جکڑ بندیوں میں گھر جاؤگے - زندگی مستقل اصولوں کی روشنی میں بدلنے والے قوانین ہی سے آگے چل سکتی ہے -

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا لٹریچر جس قدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے ''پیشگی جریداران'' کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک مشت یا پچیس روپے کی ماہانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تاآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح — — —

- ✶ آپ کی پیشگی رقم سے ہمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- ✶ آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

رابطہ باہمی

طلوع اسلام کے قارئین مختلف مقامات میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں باہمی رابطہ کے لئے ضروری ہے کہ ہر شہر میں ایک ''بزم طلوع اسلام'' قائم کی جائے۔ اراکین بزم باہمی مشوروں سے یہ سوچیں کہ اس قرانی فکر کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کے لئے کیا طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد آپ اپنی تجاویز سے ہمیں مطلع کریں جنہیں (حسب ضرورت) طلوع اسلام میں شائع کیا جائیگا۔ واضح رہے کہ بزم کسی قسم کی الگ پارٹی نہیں ہوگی نہ ہی اس کی طرف سے کوئی لٹریچر (بلا اجازت طلوع اسلام) شائع کیا جائیگا۔ یہ صرف قرانی فکر سے ہم آہنگی رکھنے والوں کے مشاورتی اجتماعات کا ذریعہ ہوگی۔ ہر بزم کا ایک ترجمان ہوگا جس کی وساطت سے بزم مدیر طلوع اسلام سے خط و کتابت کریگی۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- ✶ طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ہی برتاؤ کریگا۔
- ✶ حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باہمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجئے۔
- ✶ رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- ✶ مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے
- ✶ پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- ✶ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۷۳۔ کراچی۔

ہفت روزہ

طلوع اسلام

جلد ۸	۱۲ فروری ۱۹۵۵ء	نمبر ۲

طلوع اسلام کا مسلک

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں بتایا جا چکا ہے، طلوع اسلام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ کو پھر سے اسی طرح قرآنی خطوط پر متشکل کر دیا جائے جس طرح یہ نبی اکرمؐ کے عہد ہمایوں میں متشکل ہوا تھا۔ چونکہ قرآنی معاشرہ میں مذہبی پیشوائیت کی کوئی جگہ نہیں ہوتی (چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ نبی اکرمؐ کے عہد مبارک میں "مولوی" کا کہیں نام تک دکھائی نہیں دیتا۔) اس لئے مولوی صاحبان کی طرف سے ہر اس تحریک کی مخالفت ہوگی جو مسلمانوں کو قرآن کی طرف دعوت دے۔ اس بنا پر ان کی طرف سے طلوع اسلام کی مخالفت بھی ضروری تھی۔ یہ حضرات طلوع اسلام کے پیش کردہ قرآنی دلائل کا جواب تو دے نہیں سکتے تھے اس لئے انہوں نے اس کے خلاف وہی حربہ استعمال کیا جسے اپنے مخالفین کے لئے شروع سے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ اُنھوں نے مشہور کر دیا کہ طلوع اسلام منکرِ حدیث ہے اور اس طرح عوام کے جذبات کو اس کے خلاف مشتعل کر دیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ (طلوع اسلام کے دورِ جدید کے شروع ہی میں) واضح طور پر بتا دیں کہ اس باب میں ہمارا مسلک کیا ہے تاکہ قارئین کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے کچھ اصول و ضوابط عطا کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ان کا معاشرہ جنتی معاشرہ بن سکتا ہے۔ یہ اصول و ضوابط قرآن کے اندر محفوظ ہیں۔ انہی کا نام الدین ہے۔ قرآن نے (بجز چند احکام کے) باقی اصولوں کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اس لئے کہ زندگی کے اصول تو غیر متبدل رہتے ہیں لیکن ان کی جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان، ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مقتضیات کے مطابق، اپنے لئے جزئیات آپ متعین کریں۔ لیکن یہ جزئیات افراد متعین نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ نظام متعین کرے گا جو قرآنی اصولوں کی تنفیذ کے لئے قائم ہوگا۔ اس قسم کا نظام سب سے پہلے خود نبی اکرمؐ نے قائم کیا اور دین کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان کی جزئیات متعین فرمائیں۔ رسول اللہؐ کے بعد یہ نظام کچھ عرصہ تک قائم رہا۔ اگرچہ اس قلیل سی مدت میں زمانے کے تقاضے کچھ زیادہ بدلے نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود، جن جن امور میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی ان میں تبدیلیاں کر لی گئیں (تفصیل ان امور کی ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اسلامی نظام" میں ملے گی)۔ اگر یہ نظام اسی طرح آگے بڑھتا تو ان جزئیات میں رد و بدل اور حک و اضافہ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ لیکن افسوس کہ یہ نظام جلدی ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی ان جزئیات میں رد و بدل کرنے کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اب اُمت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ جو جزئیات اس سے پہلے متعین ہو چکی تھیں، انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا جاتا۔ ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا کہ جو جزئیات کتبِ روایات میں ملتی ہیں انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ (انہیں اہلِ حدیث کہا جاتا ہے) دوسرے گروہ نے کہا کہ جو جزئیات ائمہ فقہ نے مرتب کی تھیں ان پر عمل کیا جائے (انہیں اہلِ فقہ کہتے ہیں) لیکن جزئیات، کتبِ روایات میں ہوں یا کتبِ فقہ میں، ظاہر ہے کہ وہ سب کی سب زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ ان میں اکثر ایسی ہیں جن میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ لیکن اربابِ مذہب نے اس چیز کو عقیدہ میں داخل کر لیا کہ ان میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک یہ چیزیں نظری حیثیت لئے رہیں کوئی خاص دقت پیش نہ آئی۔ لیکن جب کسی مملکت نے چاہا کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا بھی ساتھ دے اور شریعت پر عمل پیرا بھی رہے، تو وہاں ان جزئیات کے غیر متبدل ہونے نے عملی دشواری پیدا کر دی۔ یہ صورت سب سے پہلے ترکی میں پیش آئی اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ وہاں انہیں کوئی بتانے والا نہیں تھا کہ غیر متبدل صرف قرآن کے اصول ہیں۔ ان کی جزئیات میں قرآنی نظام رد و بدل کر سکتا ہے۔

یہی صورتِ حالات اب پاکستان میں پیش آرہی ہے اور طلوع اسلام کی یہ کوشش ہے کہ مملکت کو بتائے کہ دین اور اس کی جزئیات کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ اس نے اس سات سال کے عرصہ میں بار بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ اگر مملکتِ پاکستان اپنے آئین کو قرآنی خطوط پر متشکل کرنا چاہتی ہے اور اسے ایسا ہی کرنا ہوگا۔ (کیونکہ پاکستان کو حاصل ہی اس مقصد کے لئے کیا گیا ہے) تو اس کی عملی شکل یہ ہوگی کہ نظامِ مملکت قرآن کے غیر متبدل اصولوں کو اپنے سامنے رکھے۔ ان اصولوں سے کسی صورت میں تصادم یا تجاوز نہیں کیا جا سکے گا اس کے بعد وہ ان تمام جزئیات کو اپنے سامنے رکھے جو اس سے پہلے مختلف زمانوں میں مدوّن کی گئی تھیں (اور جو کتبِ روایات و فقہ میں ملتی ہیں) اس تمام سرمایہ کی روشنی میں اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ جزئیات متعین کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ سابقہ جزئیات میں سے انہی کو بدلا جائیگا جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوگی جن میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوگی انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے

طلوع اسلام کا کہنا یہ بھی ہے کہ جب تک قرآنی نظام ہماری موجودہ جزئیات میں رد و بدل نہ کرے ہمیں ان کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ کسی فرد یا کسی جماعت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اس میں رد و بدل کرے، اسے صحیح قرار دے اور باقی سب کو غلط۔ ایسا کرنے سے ملت میں خواہ مخواہ انتشار پیدا ہوگا اور ایک اور فرقہ وجود میں آجائے گا۔ (یہی تھی وہ غلطی جو ان لوگوں کی طرف سے سرزد ہوئی جو آج سے کچھ وقت پہلے "اہلِ قرآن" کے نام سے متعارف ہوئے) البتہ یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ ان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہو۔ جو اس کے خلاف ہوگی اس کی طرف قوم کی توجہ دلانا نہایت ضروری ہوگا۔ چنانچہ طلوع اسلام اس فریضہ کو بھی سرانجام دے رہا ہے۔

اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ ہماری کتبِ احادیث اور تاریخ میں بہت سی باتیں ایسی شامل ہو گئی ہیں جن سے نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ بڑی داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت شرفِ انسانیت کی بلند ترین سطح کی آئینہ دار تھی۔ اس میں اس قسم کی کثافتیں معاندین کی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کثافتوں کو الگ کر کے آپؐ کی سیرتِ طیبہ کو اصلی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ (اس قسم کی پہلی کوشش محترم پرویز صاحب کی مایۂ ناز تصنیف "معراجِ انسانیت" میں ملے گی)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں طلوع اسلام کے وہ "جرائم" جن کی پاداش میں مولوی صاحبان نے اس کے خلاف "منکرِ حدیث" کا لیبل تراش کر اپنے آپ کو خوش کر لیا ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے "فتنے" کا سر کچل دیا ہے۔ آپ نے ان جرائم کی فہرست پر (جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) ایک بار پھر نگاہ ڈالیئے اور خود فیصلہ کیجئے کہ اس میں کونسی بات دین کے خلاف ہے؟

قرآنی معاشرہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے - اس معاشرہ میں کوئی شخص زندگی کی کسی بنیادی ضرورت سے محروم نہیں رہتا اور جو صلاحیتیں اسے فطرت کی طرف سے ملتی ہیں وہ دبی کی دبی نہیں رہ جاتیں - ظاہر ہے کہ مملکت اس ذمہ داری سے اس صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے جب رزق کے سرچشمے (وسائل پیداوار) افراد کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، خود مملکت کی تحویل میں بطور امانت رہیں - اس کا نام نظام ربوبیت ہے - چونکہ اس نظام میں ان افراد کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی ہے جو دوسروں کی محنت پر زندہ رہنے اور عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، .. ..

.. .. .. اس لئے سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے بھی اس کی مخالفت ہوتی ہے اور ارباب مذہب کی طرف سے بھی - کیونکہ ارباب مذہب کا شمار خود اس طبقہ میں ہے جو خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں - اس مقصد کے لئے ارباب شریعت طلوع اسلام کو نہ معلوم کیا کیا کہہ کر یاد فرماتے ہیں - یاد رکھئے اس دور کا سب سے مہیب خطرہ کمیونزم ہے - لیکن مسلمانوں میں کمیونزم اپنے بل بوتے پر بار نہیں پا سکتی - یہ بڑھ رہی ہے اس غلط مذہب کی وجہ سے جسے مُلا پیش کر رہا ہے اور جس سے تنگ آ کر قوم کا نوجوان طبقہ کمیونزم کے آغوش میں چلا جا رہا ہے - کمیونزم کا صحیح علاج، قرآن کی حقیقی تعلیم کے اندر ہے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے -

یہ ہے طلوع اسلام کا مسلک .. جسے مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس اُمت کو جو (اقبال کے الفاظ میں) "کشتۂ سُلطانی و مُلائی و پیری" ہے - انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام سے نکال کر، خالص نظام خداوندی کے تابع لانا چاہتا ہے - آپ اس مسلک کو غور سے دیکھئے اور پھر سوچئے کہ اس کی دعوت، صحیح راستے کی طرف ہے یا نہیں - اگر آپ اسے صحیح راستے کی طرف دعوت سمجھیں تو پھر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہ مخالفین اس کے متعلق کیا کیا پروپیگنڈہ کرتے ہیں، آپ اس کا ساتھ دیجئے - آپ کی یہ معاونت "برو تقویٰ" کی معاونت ہوگی - جس کی تاکید قرآن کرتا ہے -

وُہ اور ہم

کرکٹ کے تیسرے ٹیسٹ میچ کے دیکھنے کے لئے جو بائیس ہزار ہندوستانی پاکستان آئے اور اُن سے مسلمانان لاہور نے جو بے تکلفانہ اور فیاضانہ سلوک روا رکھا، اس کی تفصیلات اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں - یہ پہلا موقع تھا کہ سکھ اس آزادی سے پاکستان کی حدود میں داخل ہوئے اور اہل پاکستان نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا، اگر سات سال تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ سکھ پاکستان میں بغیر پولیس کی حفاظت کے آجا نہیں سکتے تو اس کی ذمہ داری خود سکھوں پر ہی عائد ہوتی تھی - تقسیم ہند سے ذرا پیشتر اور اس کے فوراً بعد انہوں نے ہندوؤں کی شہ پر جس بے دردی سے تلوار نیام سے نکالی اور جس بے دردی اور بے رحمی سے لاکھوں مسلمانوں ـــ جوانوں بوڑھوں اور بچوں ـــ کو موت کے گھاٹ اتارا اور ان کی ہزاروں ماؤں اور بہنوں کو ذلیل و رسوا کیا، اس کی مثال ساری تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گی - کوئی خود دار قوم اس درندگی اور بہیمیت کو فراموش نہیں کر سکتی گر یہ ہندو اور سکھ اپنے سابقہ رویہ اور عمل پر اظہار ندامت و تاسف کے بعد لاہور آتے تو اور بات تھی لیکن ان کی طرف سے اس قسم کی کسی معذرت و ندامت کے بغیر مسلمانان لاہور نے ان سے جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا ہے معاف کیجئے ہمارے نزدیک وہ اسلامی اخلاق کا نہیں بلکہ بے حمیتی کا مظاہرہ تھا - اس سے ہماری مراد ہرگز یہ نہیں کہ ہندوؤں یا سکھوں کو پاکستان میں آنے جانے اجازت نہیں ہونی چاہیئے یا اُن سے حسن سلوک نہیں کیا جانا چاہیئے - ہمیں خوشی ہوگی کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات خوشگوار ہوں - لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ یہ کچھ آخر ایک طرفہ کیوں ہو؟ کیا خیر سگالی کی فضا پیدا کرنے کی ذمہ داری تنہا پاکستان پر عائد ہوتی ہے؟ گذشتہ سات سال میں پاکستان نے ہندوستان کو خوش کرنے اور اُسے آمادہ بہ مفاہمت کرنے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا؟ اور تو اور کشمیر جیسے اہم معاملہ میں بھی ہمارے سابق وزیر خارجہ نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ پاکستان کشمیر سے اپنی ساری فوج واپس بلانے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ ہندوستان وہاں اپنی فوج کم کر دے - حالانکہ معاہدے کی رُو سے دونوں ممالک کی معین افواج کو کشمیر میں رہنا چاہیئے تھا - لیکن ہندوستان نے کیا کیا؟ وہ کشمیر کو بدستور اپنی جائز وراثت قرار دے رہا ہے اور دریاؤں کا پانی بند کر کے ہماری زرخیز زمینوں کو بنجر بنا دینے پر تلا ہوا ہے - ۱۹۴۸ء کے واقعہ کو چھوڑ دیجئے جب ہندوستان نے پانی بند کر کے پاکستان کو بھوکوں مارنا چاہا تھا - اب بھی اس نے نہروں کا پانی روک رکھا ہے اور پنجاب میں فصلیں تباہ ہو رہی ہیں - کیا اس سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ نہروں کے بند کھول دے؟ تازہ خیر سگالی کی فضا جو محض پاکستان کی کوششوں سے پیدا ہوئی ہے، اس کا جو احترام ہندوستان میں ہو رہا ہے وہ بھی دنیا سے مخفی نہیں - بخشی غلام محمد کی اس ہرزہ سرائی کو بالفرض نظر انداز بھی کر دیا جائے کہ کشمیر کا مسئلہ طے شدہ ہے تو بھی گورنر مشرقی پنجاب کے اس بیان کا کیا مفہوم سمجھے گا، جو اس نے عین اس دن دیا تھا جب ہمارے گورنر جنرل ان کے ہاں بطور مہمان گئے تھے) کہ چونکہ کشمیر کی "مجلس دستور ساز" نے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کر لیا ہے اس لئے اب اس سے پاکستان کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے - کیا اس سے ہندوستانی ذہنیت میں کچھ بھی تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں؟

اور دیکھئے لاہور آنے اور مسلمانوں کی فیاضی سے متمتع ہونے والوں میں روزنامہ "پرتاپ" جالندھر کے ایڈیٹر مسٹر ویریندر بھی تھے - وہ اپنے اخبار میں اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کا کیوں ایسا پر تپاک خیر مقدم کیا اور لکھتے ہیں:-

> ان لوگوں کی جو حالت ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ پاکستان کے عوام اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ جس پالیسی پر اس وقت تک ان کی حکومت گامزن رہی ہے، اس پالیسی نے انہیں تباہ کر دیا ہے ...... اگر اب پاکستان نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ جس راستہ پر وہ چل رہا تھا غلط ہے تو دونوں ملکوں میں غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں -

اب اس "حالت" کی تفصیل بھی سنئے - لکھتے ہیں:-

> جب ایک تانگے والے سے پوچھا گیا کہ ان کی حالت کیسی ہے، تو اس نے کہا کہ دعا دیتے ہیں آپ لوگوں کو جن کے آنے سے شہر میں رونق ہو گئی ہے اور ہمیں بھی دو پیسے کمانے کا موقع مل گیا ہے ورنہ آگے پیچھے تو اللہ اللہ خیر سلا والا معاملہ ہے -
>
> لاہور میں تانگے ہیں تو کافی لیکن ان کا استعمال کرنے والے بہت کم ہیں - یہی حال کچھ پھل اور سبزی فروشوں کا ہے - جو بھائی لاہور سے آئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ لاہوری دروازہ کے باہر پھل اور سبزی کی بہت بڑی دوکانیں ہوا کرتی تھیں، وہ اب ختم ہو چکی ہیں - ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی دوکانیں رہ گئی ہیں - اس کی وجہ یہ ہے کہ پھل اور سبزیاں خریدنے والے ہی پاکستان سے چلے گئے تو اب وہ دوکاندار وہاں رہ کر کیا کریں -

اس اقتباس کا مطلب بالکل واضح ہے - اہل لاہور نے جس کشادہ دلی اور مہمان نوازی کا ثبوت دیا اس کی قیمت مہمانوں کی نگاہوں میں صرف اس قدر ہے کہ اہل لاہور بھوکوں مر رہے تھے اور ان ہندوستانیوں کے آنے سے انہیں دو پیسے مل گئے - یہ آئینہ ہے اس ذہنیت کا جو بھارت کے ہندوؤں اور سکھوں میں پیدا ہو چکی ہے - ہم اپنے ہاں کے خواص سے تو کچھ نہیں کہتے کہ ان کی مصلحتیں گوناگوں ہیں، البتہ عوام سے اتنا ضرور کہتے ہیں کہ وہ اپنی گردنیں ذرا نیچی کر لیں تاکہ ان کی مہمان نوازیوں کے اعتراف میں ہندوستان سے آیا ہوا یہ ہار - ان کے گلے میں ڈالا جا سکے!

کوائف پاکستان

مغربی پاکستان کا ایک صوبہ بنانے کے لئے جو کونسل مقرر کی گئی تھی وہ اپنا کام بہ سرعت تمام پایۂ تکمیل تک پہنچا رہی ہے اس کی رفتار ترقی کا یہ حال ہے کہ پوری رپورٹ کے ان دنوں مرتب ہوجانے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ اس سے پیشتر اس مقصد کے لئے مارچ کے وسط کا تعین کیا گیا تھا۔ مکمل رپورٹ پر مرکزی کابینہ کے ارکان اور صوبائی وزرائے اعلیٰ غور کریں گے اور پھر نئے صوبے کے قیام کی تاریخ کا اعلان کردیا جائے گا۔

مغربی پاکستان کونسل اپنے لاہور کے اجلاس میں ذیلی کمیٹیوں کی رپورٹوں کو بھی تیار کر رہی ہے۔ اور اپنی پوری رپورٹ بھی مرتب کر رہی ہے۔ کونسل کے سامنے اہم سوال نئے صوبے کی انتظامی ہیئت کا ہے۔ اسے موجودہ صوبوں کو ختم کرکے تمام سکریٹریٹ کے دفاتر کو ملا کر ایک سکریٹریٹ قائم کرنا ہے۔ اس سے نہ صرف موجودہ صوبائی محکمے ایک دوسرے میں مدغم ہوں گے بلکہ صوبائی ملازمتوں کو بھی ملا کر ایک کرنا ہوگا۔ مزید برآں گیارہ کمشنریوں کی ہیئت و تنظیم کا بھی سوال ہے۔ ان سے متعلق رپورٹیں تقریباً تیار ہو چکی ہیں۔ متعلقہ ذیلی کمیٹی کے ایک ترجمان نے بتایا ہے کہ ان کا کام صرف اتنا نہیں ہے کہ متفرق دفاتر اور ملازمتوں کو ملا دیا جائے بلکہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ہیئت انتظامیہ بہتر سے بہتر طریق سے کام کر سکے اور روزمرہ کے پیش آنے والے مسائل سے کم سے کم وقت میں اور زیادہ سے زیادہ اہلیت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوا جا سکے۔ چنانچہ کمشنروں اور ڈپٹی کمشنروں کو ایسے اختیارات دینے کا خیال ہے کہ وہ پبلک کی شکایات خود سن کر ان کا ازالہ کر سکیں۔ اس کا یہ فائدہ ہوگا کہ ضلعی حکام عوام سے براہ راست رابطہ رکھ سکیں گے جو موجودہ حالات میں ممکن نہیں اور جس کے بغیر چند در چند خرابیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

نئے صوبے کا قیام

موجودہ اوقات نامے کے مطابق کونسل ۱۲ر فروری کو لاہور میں اپنا آخری اجلاس منعقد کرے گی اور اس میں اپنی مکمل رپورٹ پر غور کرکے اسے حکومت کے حوالے کر دے گی۔ رپورٹ ملنے پر مرکزی کابینہ منعقدہ اجلاسوں میں اس پر غور کرے گی اور پھر مرکزی کابینہ، صوبائی اور ریاستی سرکاری نمائندے مل کر اس پر غور و خوض کریں گے۔ جب یہ مراحل طے ہو جائیں گے تو یہ اعلان کر دیا جائے گا کہ موجودہ صوبے کب ختم ہوں گے اور نیا صوبہ کب معرض وجود میں آئے گا۔ لاہور سے آمدہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی پاکستانی صوبے کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوگا۔ گورنر جنرل ایک آرڈیننس کے ذریعے صوبوں اور ریاستوں کے خاتمے اور نئے صوبے کے قیام کا اعلان کریں گے۔ نئے صوبے کے گورنر کے مشیر موجودہ وزراء ہوں گے۔ یہ ہیئت امریکی انداز کی ہوگی اس لئے اسے مروجہ معنوں میں مشیروں کی حکومت نہیں کہا جا سکے گا۔ ان میں کوئی وزیر اعلیٰ نہیں ہوگا۔ یہ وزراء گورنر کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ کیونکہ مجلس مقننہ انتخابات کے بعد ہی معرض وجود میں آسکے گی۔ نئے صوبے کے قیام کا اعلان ۲۳ر مارچ کو ہوگا۔ یہ وہ تاریخی دن ہے جب لاہور میں پندرہ سال پہلے مسلم لیگ نے قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ اس تاریخ کو قیام پاکستان کے بعد فراموش کر دیا گیا۔ حالانکہ اسے ایک ملی تقریب بن جانا چاہیئے تھا۔ یہ عمدہ موقع ہوگا کہ صوبوں کے خاتمے کا اعلان، جو قیام پاکستان کے بعد پہلا انقلابی قدم ہے، اسی یادگار تاریخ کو کیا جائے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسا ہو سکے گا یا نہیں۔ ملک فیروز خاں نون نے ۷ر فروری کے بیان میں ان اطلاعات کو غلط قرار دیا ہے جن سے نئے صوبے کے جلدی قیام کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس کے لئے بڑی منصوبہ بندی کی ضرورت ہوگی اور طرح طرح کے قانونی اور دستوری مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اس لئے اس پر لامحالہ وقت لگے گا۔ ان کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان مراحل سے ۲۳ر مارچ تک گزرا جا سکے گا یا نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ موجودہ صوبائی اسمبلیاں اپنے اپنے بجٹ منظور کریں گی اور پھر ان کو اس دن توڑ دیا جائے گا۔ جس دن موجودہ صوبے اور ریاستیں ختم ہوں گے اور نیا صوبہ بنے گا۔ جو اسمبلیاں اس وقت تک بجٹ منظور نہیں کر سکیں گی ان کا بجٹ نیا صوبہ منظور کرے گا۔ ان صوبائی اور ریاستی بجٹوں کو ملا کر نئے صوبے کا بجٹ بنایا جائے گا۔

شبہات کا ازالہ

۷ر جنوری کو بلچھی ان میں تقریر کرتے ہوئے سندھ کے وزیر مال، پیر علی محمد راشدی نے نئے صوبے کے سلسلہ میں پنجاب کی قربانی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اس صوبے نے نئی اسمبلی میں ہی چالیس فی صدی نیابت قبول نہیں کی بلکہ نئی حکومت میں بھی چالیس فی صدی نمایندگی قبول کی ہے۔ گویا نئی کابینہ میں پہلے دس سال کے لئے صرف چالیس فی صدی پنجاب کے نمایندے ہوں گے۔ مزید براں دس سال تک صوبے کا وزیر اعلیٰ بھی غیر پنجابی ہوگا (اور یہ لکھا گیا ہے کہ نئے صوبے کا وزیر اعلیٰ نہیں ہوگا۔ یہ اطلاع درست نکلی تو یہ عبوری دور یعنی انتخابات سے پیشتر تک کے زمانے سے متعلق ہوگی) پیر راشدی صاحب نے اہل سندھ کو بتایا کہ مغربی صوبے کا قیام ان کے لئے اور پنجاب، بلوچستان، سرحد، بہاولپور کے غریب طبقہ آبادی کے لئے خاص طور پر فائدہ مند ہوگا۔ اس وقت سندھی وڈیرے ان پر ظلم و تعدی نہیں کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اہل ثروت طبقہ وحدت کا مخالف ہے۔ اس جلسے میں مسٹر سہروردی وزیر قانون نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے بھی وحدت کے فوائد گنوائے اور سامعین کو بتایا کہ اس میں پنجاب کے تفوق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس سے ملک کی خدمت کا زیادہ سے زیادہ موقع میسر آجائے گا اور رفاہی اور تعمیری کام زیادہ دلچسپی سے کئے جا سکیں گے۔ زرعی اصلاحات، مہاجرین کی بحالی، آبپاشی کے منصوبے، تعلیمی لائحہ عمل وغیرہ معاملات میں یکساں طریق کار اختیار کیا جا سکے گا اور اس کا فائدہ پورے مغربی پاکستان میں مساوی ہوگا۔

نیا آئین

جو نیا آئین زیر تسوید ہے اس میں پاکستان کو ایک جمہوریہ بنایا جائے گا۔ بعض اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ جمہوریہ کے قیام کا اعلان ۱۴ر اگست کو یعنی پاکستان کے آٹھویں یوم آزادی پر کیا جائے گا۔ اس سے پیشتر (یعنی اب سے کوئی تین چار ماہ بعد) گورنر جنرل ایک آئینی کنونشن طلب کریں گے جو آئین کو منظور کرے گا۔ اس منظوری کے بعد یوم آزادی پر اس کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی اعلان نہیں ہوا کہ یہ کام کن حضرات کے سپرد ہوا ہے۔ انہوں نے اس کے لئے کون کون سے اصول طے کئے ہیں اور اس آئین کی بنیاد کیا ہوگی۔ یہ امور اگر سامنے آجاتے تو اچھا تھا۔ بہرحال اس کا تو ذکر آگیا ہے کہ پاکستان جمہوریہ بن جائے گا۔ جمہوریہ بن جانے پر پاکستان کا آئینی تعلق دولت مشترکہ سے وہ نہیں رہے گا جو اب ہے۔ اب ایک نوآبادی ہونے کی حیثیت سے پاکستان کے گورنر جنرل، ملکہ معظمہ برطانیہ کے نمایندے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ نمائندگی عملاً برائے نام ہے لیکن آئینی اعتبار سے بہرحال ہے۔ جمہوریہ بن جانے پر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ ضمناً لندن میں اس کا بھی اعتراف کیا گیا کہ پاکستان کو مشرق وسطیٰ کے دفاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے اور یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ پاکستان نے ترکی سے معاہدہ کرکے اسی اہمیت کے تقاضے کو پورا کیا ہے۔ نیز اسی اہمیت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے عزائم کے مطابق دیگر ممالک سے بھی ایسے معاہدے کرے۔ ان اقدامات کو اس لئے بھی سراہا گیا کہ دولت مشترکہ اور ممالک مشرق وسطیٰ کے مابین پاکستان ہی ایک رابطہ (رابطے) کا کام دے سکتا ہے۔ ہندوستان نے قابل فہم وجوہ کی بنا پر ان معاہدوں اور مجوزہ دفاعی تنظیموں کی مخالفت کی اور امریکہ کو بھی اس کا ذمہ دار گردانا مگر مجموعی طور پر پاکستان کے مقاصد اور ارادوں کو بنظر استحسان ہی دیکھا گیا۔ اس پس منظر میں رئیسان مملکت ترکیہ اور اردن کے دورے بڑے اہم ہو جاتے ہیں۔ صدر ترکیہ جناب جلال بایار ۱۸ر فروری کو پاکستان تشریف لا رہے ہیں۔ پاکستان اور ترکی میں معاہدہ ہونے سے پہلے ہمارے گورنر جنرل ترکی کا دورہ کر چکے ہیں۔ یہ دورہ اس دورے کا جواب یا اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ مشرق وسطیٰ میں جو وفاقی تگ و دو ہو رہی ہے اسے اس دورے سے بڑی تقویت ملے گی۔ شاہ اردن کی تشریف آوری بھی کم اہم نہیں وہ ۵ر مارچ کو یہاں پہنچیں گے۔ عرب ممالک میں اردن اقوام مغرب کی طرف رجحان رکھتا ہے اور پاک ترکی اور ترکی عراقی معاہدوں کا بھی حامی ہے۔ اس دورے میں مزید افہام و تفہیم سے کام لیا جا سکے گا اور ہو سکتا ہے کہ عراق کی مثال سے فائدہ اٹھا کر اردن بھی ان معاہدوں میں شرکت پر آمادہ ہو جائے۔

عالم اسلامی

مجوزہ ترکی عراقی معاہدے کے بارے میں مصر نے جو طوفان اٹھایا وہ تھما تو نہیں لیکن اب مطلع صاف ہوتا جا رہا ہے اور وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ مصر عراق پر ذرہ بھر بھی دباؤ نہیں ڈال سکا اور اسے کسی قسم کی تخویف و ترغیب سے معاہدے کے خیال سے باز نہیں رکھ سکا۔ مصر نے ۲۲ جنوری کو عرب ممالک کے وزرائے اعظم کی کانفرنس طلب کی لیکن اسے بہت جلد احساس ہوگیا کہ عراق کے خلاف مطلوبہ فضا پیدا کرنے کے قابل نہیں کیونکہ تمام شرکائے کانفرنس پوری طرح اس کے ہم خیال نہیں تھے۔

مصر کے متشدد رویہ کے پیش نظر قاہرہ کانفرنس کے سامنے دو صورتیں تھیں۔ یا تو عراق کو عرب لیگ سے خارج کردیا جاتا۔ اور یا ترکی عراقی معاہدہ کو قبول کرلیا جاتا۔ مصر اگر مؤخرالذکر صورت کے لئے تیار نہ تھا تو اول الذکر کی ہمت بھی نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ یہ درمیانی راہ اختیار کی گئی کہ لبنانی وزیر اعظم، ریاض الصلح، کی قیادت میں ایک وفد نوری السعید سے براہ راست گفتگو کرنے کے لئے بغداد جائے۔ بظاہر ایسے وفد کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وزیر اعظم عراق ناسازی طبع کی وجہ سے خود تو قاہرہ نہیں جاسکے تھے لیکن انہوں نے وزیر خارجہ ڈاکٹر جمالی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ بہرحال ایک چار رکنی وفد نوری السعید سے ملاقی ہوا۔ جیسا کہ قائد وفد، الصلح نے بغداد میں کہا، ان کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کی عمومی حکمت عملی یکساں اور ہم آہنگ رہے۔ مصر نے عراق پر الزام لگایا تھا کہ ترکی سے معاہدہ کرنے کا فیصلہ کرکے وہ عربی انداز سیاست سے ہٹ گیا ہے، لیکن وفد کو وزیر اعظم عراق نے بتایا کہ عراق بدستور عرب لیگ کی حکمت عملی پر کاربند ہے اور عربی استحکام کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے گا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے تحفظ اور مفاد کی خاطر کسی دوسری قوم سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں کرسکتا۔ بغداد کے ایک سرکاری اعلامیہ میں اس کی مزید تشریح بھی کی گئی۔ اس میں بتایا گیا کہ دسمبر ۱۹۵۴ء میں عرب وزرائے خارجہ کی جو کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں بھی عراقی وزیر خارجہ نے یہ اعلان کیا تھا کہ عراق مشترکہ عربی حکمت عملی پر کاربند رہتے ہوئے بھی یہ حق رکھتا ہے کہ دوسرے ممالک سے حسب ضرورت معاملہ کرسکے۔ عراقی حکومت نے بعد میں باقاعدہ طور پر تمام عربی حکومتوں کو ایک مراسلہ لکھ کر اس اعلان کی تصدیق بھی کردی تھی۔

مصر کی ضد

مصر عراق کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔ چنانچہ مصری وزیر، میجر صالح سلیم، جو اس وفد کے رکن تھے، انہوں نے رویہ میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں کی۔ اس کا یہی نتیجہ نکلنا چاہیئے تھا کہ مذاکرات ناکام ہوتے۔ چنانچہ وفد بغداد سے بے نیل و مرام واپس آیا۔ ناکامی کے اعلان سے پیشتر صدر لبنان، شمعون نے معاملہ ہاتھ میں لیا اور مفاہمت کی نئی کوشش شروع کی۔ انہوں نے تجویز پیش کی کہ بیروت کی غیر جانبدار فضا میں مصر اور عراق کے وزرائے اعظم ملیں اور باہمی افہام و تفہیم سے کام لیں۔ نوری السعید نے اس تجویز کو قبول کرلیا لیکن کرنل ناصر نے اسے مشروط قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ نوری السعید بیروت میں ان سے ملاقات کے لئے آنے سے پیشتر یہ اعلان کریں کہ کیا وہ ترکی عراقی معاہدے پر مصر ہیں یا اس کی کوئی متبادل تجویز پر غور کرنے کے لئے تیار ہونگے؟ دوسرے کیا وہ عرب لیگ کی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنے پر رضامند ہیں؟ نوری السعید نے ان شرائط کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے پھر کہا کہ وہ کرنل ناصر سے ملنے کے لئے تیار ہیں لیکن ایسی ملاقات غیر مشروط ہونی چاہیئے۔ کرنل ناصر کی ضد اور نوری السعید کے اس جواب کے بعد بیروت والی ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لبنانی وزیر اعظم نے کرنل ناصر کو سمجھایا کہ وہ اپنی شرائط واپس لے لیں اور نوری السعید سے مل لیں۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لبنان مفاہمت سے مایوس ہوچکا ہے چنانچہ صدر شمعون نے وزیر اعظم، الصلح، کو ہدایت کردی ہے کہ وہ مصری عراقی تنازعہ میں غیر جانبدار رہیں۔

اب قاہرہ میں عربی وزرائے اعظم کی کانفرنس کا اجلاس پھر شروع ہوگیا ہے۔ حالانکہ سابقہ اطلاعات سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اجلاس ملتوی ہوجائے گا۔ اس کانفرنس کے سامنے یہی اہم سوال ہے کہ اب کیا فیصلہ کیا جائے؟ مصر کے متعلق چند دنوں سے یہ خبریں آرہی ہیں کہ اگر عراق معاہدے سے باز نہ آیا تو وہ عرب لیگ کے مشترکہ دفاعی معاہدے سے علیحدہ ہوجائے گا۔ اب تک اسے اس انتہا پسندانہ اقدام کرنے سے باز رکھا گیا ہے لیکن مصر کا مقصد یہ نظر آتا ہے کہ اس معاہدے کو جو ابھی تک شرمندۂ عمل نہیں ہوسکا۔ بدل کر وہ عراق کے بغیر نیا معاہدہ دفاع مرتب کرے جس کی قیادت اسی کے سپرد ہو۔ چنانچہ مصری کابینہ نے اس قسم کا فیصلہ بھی کرلیا ہے۔ ایسی تنظیم کو غیر جانبدار رکھنے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کرنل ناصر نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ عربی دفاع کے لئے کسی غیر ملک سے کوئی مدد نہیں مانگیں گے۔ حالانکہ اس سے پیشتر ان کی حکومت کئی مرتبہ یہ اعلان کرچکی ہے کہ مصر اقوام مغرب کے ساتھ ہے۔ ادھر ناصر صاحب غیر جانبداری کے دعوے باندھ رہے ہیں۔ واشنگٹن میں اُن کے سفیر امریکہ کو تیار رہے ہیں کہ غیر جانبداری کا اصول ختم ہوچکا ہے۔ عراق اپنے رویہ پر قائم ہے۔ بغداد کی ایک اطلاع سے معلوم ہوتا ہے کہ نوری السعید نے کہا ہے کہ اگر عراق کو عرب لیگ سے نکال بھی دیا گیا تو وہ اپنی حکمت عملی نہیں بدلے گا اور عربی مفاد کے تحفظ کے لئے کوشاں رہے گا۔ عراق نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور انتہائی کوشش کی ہے کہ عرب ممالک متحد رہیں۔ نوری السعید نے قاہرہ سے آنے والے وفد پر عراقی ترکی معاہدے کے فوائد واضح کرتے ہوئے درخواست کی کہ تمام ممالک عربیہ اس معاہدے میں شریک ہوجائیں۔ عراق کا رویہ بالکل قابل فہم ہے لیکن مصر قیادت کے جنون میں اندھا ہوکر عرب لیگ میں پھوٹ ڈلوا کر اسے ختم کردینا چاہتا ہے۔ اس پھوٹ کا نتیجہ خود مصر کے حق میں اچھا نہیں نکلے گا۔

پاکستان اور مشرق وسطیٰ

مجوزہ عراقی ترکی معاہدہ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی لندنی کانفرنس میں بھی زیر بحث آچکا ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی درپیش آئی کہ دولت مشترکہ مشرق وسطیٰ کے دفاع میں برطانیہ کی وجہ سے دلچسپی لیتی ہے اور اس لئے بھی کہ پاکستان دولت مشترکہ کا بھی رکن ہے اور مشرق وسطیٰ کی مجوزہ دفاع کا بھی۔ پنڈت نہرو نے ان دفاعی معاہدوں پر اعتراض کیا ہے ان کا اعتراض قابل فہم ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ میں پاکستان کا اثر و نفوذ گوارا نہیں کرسکتے۔ اس لئے وہ مصر کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ تاکہ وہ متعلقہ مساعی کو ناکام کرنے کی کوشش میں لگا رہے۔

ان کوائف کے پیش نظر اشتراکیت نے بھی پینترا بدل لیا ہے۔ اس علاقے میں پیشتر ازیں اس کا زیادہ تر زور ترکی اور ایران پر صرف ہوتا تھا اب یہ زور کم ہوگیا ہے بلکہ ایران سے تو روس اپنے تعلقات بہتر بناتا نظر آتا ہے۔ جنگ کے دوران میں روس نے کوئی گیارہ بارہ ٹن ایرانی سونا اپنے قبضہ میں لے لیا تھا اور اس کی واپسی کو اب تک ٹالتا چلا آرہا تھا۔ اس کے متعلق اس نے بالآخر معاہدہ کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ برسوں کے سرحدی تنازعات سے متعلق بھی معاہدہ کرلیا گیا ہے اور دوسو سے اوپر ایرانیوں کو رہا کرنے کا اعلان کردیا ہے جو اس سلسلہ میں روس کی قید میں تھے۔ ان اقدامات کا مطلب ظاہر ہے ایران نے ابھی تک پوری طرح اقوام مغرب کا ساتھ نہیں دیا گو اب قدرے وثوق سے کہا جارہا ہے کہ وہ پاکستان اور ترکی کے معاہدے میں شریک ہوجائے گا۔ روس کی کوشش یہ ہے کہ وہ ایران کی فضا بہتر بنا کر ایران کو اس معاہدے میں شریک ہونے اور پوری طرح اقوام مغرب کا ساتھ دینے سے باز رکھے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اشتراکیت نے اپنی توجہات کا مرکز عربی ممالک بالخصوص شام، اردن، اور لبنان کو بنا لیا ہے۔ لبنان کو تو کمیونسٹ سرگرمیوں کا فوجی مرکز بتایا جاتا ہے، یہیں سے سعودی عربیہ، کویت بحرین وغیرہ میں پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ شام میں خلاف امریکہ اور خلاف مغرب جذبات ابھارے جارہے ہیں گذشتہ انتخابات میں پہلی مرتبہ ایک کمیونسٹ بھی شامی پارلیمان کا رکن منتخب ہوکر آگیا ہے۔ اردن میں بھی جال پھیلایا جارہا ہے۔ وہاں فلسطینی مہاجرین کا ہجوم ہے اور ان کی بے چینی کا فائدہ اٹھا کر اشتراکیت کے لئے فضا سازگار کی جارہی ہے۔ ان حالات میں بڑا ضروری ہوجاتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے ممالک متحد ہوکر مشترک لائحۂ عمل مرتب کریں۔ تاکہ اس قسم کی مداخلت سے محفوظ ہوسکیں۔

مصر کی طرح انڈونیشیا وہ مسلمان ملک ہے جس نے اپنی پالیسی کو ہندوستان کے تابع نہیں تو اس کے مطابق ضرور بنا رکھا ہے۔ اس مطابقت میں وہ عالم اسلامی سے کسی قسم کا تعاون بحیثیت مسلمان کے روا نہیں سمجھتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انڈونیشیا پر ہندوستان کا ثقافتی اثر بہت رہا ہے اور بڑا گہرا ہے۔

ذرا غور کیجیئے۔ یورپ کے مختلف ممالک باہمی اتحاد کیلئے ایک نعرہ بلند کررہے ہیں اور وہ یہ کہ "دنیا کی جمہوریتوں کو ایک متحدہ محاذ بنانا چاہیئے" گویا وحدتِ مسلک وہ اساس و بنیاد ہو جس پر اتحاد کی عمارت قائم کی جاسکتی ہے لیکن ان کے برعکس اسلامی ممالک ہیں کہ جن کے ہاں زندگی کے بنیادی اصول تک مشترک [illegible]

تاریخی شواھد

(۲)

اب رہا یہ کہ اس قوم کا زمانہ کونسا تھا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ قومِ عاد قومِ نوحؑ کی جانشین (SUCCESSOR) تھی۔ (دیکھئے ۷/۶۹) قومِ عاد کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ امم سامیہ اولیٰ کا سب سے وسیع قبیلہ تھا جس کی شوکت و عظمت کی داستانوں کا نشان قدیم تاریخوں سے ملتا ہے اس قبیلہ نے عرب، بابل اور مصر میں بڑی بڑی سلطنتیں قایم کیں۔ عاد کا زمانہ تین ہزار سال ق۔م سے پیشتر کا متعین کیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ قومِ نوحؑ کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار سال قبل مسیح رہا (آج سے چھ سات ہزار سال پیشتر) کا تھا۔ اس لئے کہ ایک شخص (سام) کی اولاد کو قوم بننے اور پھر اتنی شوکت و عظمت حاصل کرنے کے لئے اُس زمانہ میں ہزار پندرہ سو سال کی مدت درکار ہوگی بہرحال یہ قیاس و تخمین ہے جس کی بنا ر علمائے تاریخ و اثریات کی تحقیقات پر ہے قرآن کریم تاریخ اور جغرافیہ کی کتاب نہیں۔ یہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور زندگی اور موت کے اصول پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں اقوام و ملل کا تذکرہ بھی اسی ضمن سے آیا ہے۔ بایں ہمہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان تمام اقوامِ قدیمہ کے متعلق (جن کی نسبت، اور تو اور، خود عربوں کے پاس بھی عمومی اور سطحی تعارف کے سوا، معلومات کا کچھ ذخیرہ نہ تھا) تاریخی و اثری انکشافات سے جو کچھ ابھر کر سامنے آ رہا ہے وہ ان خطوط و نقوش کے خلاف نہیں جن کا اجمالی تذکرہ قرآن کریم میں ہے۔ بلکہ ان کی تائید و تصدیق کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ دنیا میں جہاں کہیں حقیقت کی نمود ہوگی، ہو نہیں سکتا کہ وہ قرآن کے کسی اجمالی یا تفصیلی بیان سے مختلف ہو۔ اس لئے کہ قرآن یکسر حقیقت ثابتہ ہے۔ اس میں ظن و تخمین اور ریب و تشکیک کی کہیں گنجائش نہیں یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ علمی تحقیقات کی روشنی میں جہاں دیگر مذاہب کے عام "مسلمات" افسانوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ قرآنی اجمالات کی توثیق و تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ دنیا کو ابھی اور علمی ترقی کرنے دیجئے وہ خود بخود دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے کہ

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ (۴۱/۵۳)

وہ وقت دور نہیں کہ ہم انہیں خارجی کائنات اور خود ان کی نفسیاتی دنیا (یا عربوں کے اپنے اندر اور ان کے باہر کی اقوام میں) اپنی نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے تا آنکہ یہ بات نکھر کر سامنے آجائے کہ قرآن ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔

یہ تھی وہ قوم جس کی طرف حضرت نوحؑ مبعوث ہوئے۔ انسان کے عہدِ طفولیت میں سلسلۂ آمد و رفت اور ذرائعِ رسل و رسائل ایسے محدود تھے کہ جو قبیلہ جہاں تھا ایک مستغنی عن الغیر وحدت (Self-Contained Unit) تھا جسے باہر کی دنیا کے ساتھ بہت کم واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے حضرات انبیائے کرامؑ کی تعلیم کا دائرہ بھی اس خاص قبیلہ یا قوم تک محدود ہوتا تھا جس میں وہ تشریف لاتے تھے۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کے متعلق فرمایا۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ
(۷/۵۹ نیز ۱۱/۲۵ ؛ ۲۳/۲۳ ؛ ۲۹/۱۴ ؛ ۷۱/۱۰)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تھا۔ اس نے کہا اے میری قوم صرف قانونِ خداوندی کی اطاعت کرو اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ایک بڑے ہی (ہولناک) دن کا عذاب تمہیں پیش نہ آجائے۔

حضرت نوحؑ بھی اسی قوم کے ایک فرد تھے۔ اس لئے انہیں ان لوگوں کا بھائی کہا گیا ہے۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ (۲۶/۱۰۶)

اور جب ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا۔ "کیا تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت نہ کروگے۔ ؟"

ویسے بھی قبائل کی تقسیم نسلی امتیاز پر ہوتی تھی اور ایک قبیلہ (یا تھوڑی سی وسعت کے بعد قوم) ایک ہی مورثِ اعلیٰ کی اولاد پر مشتمل ہوتا تھا۔ اس لئے قبائل کے نام بھی یا ان کے جدِ اولیٰ کے نام پر ہوتے تھے، یا اس قبیلہ کی کسی عظیم الشان شخصیت کی طرف منسوب۔ قرآن کریم سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ اپنی قوم میں پہلے رسول نہیں تھے بلکہ آپ کی قوم آپ سے پہلے بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی۔ اور حضرت نوحؑ کا زمانہ وہ تھا جس میں مشیت ایزدی کے پروگرام کے مطابق اس قوم کے جرائم کے ظہورِ نتائج کا وقت آچکا تھا۔ سورہ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ (۲۶/۱۰۵)

قوم نوح نے رسولوں کی تکذیب کی۔

اسی طرح سورۂ فرقان میں ہے۔

وَقَوْمَ نُوحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ أَغْرَقْنَاهُمْ وَجَعَلْنَاهُمْ لِلنَّاسِ آيَةً ۖ وَأَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ عَذَابًا أَلِيمًا (۲۵/۳۷)

اور جب قوم نوحؑ نے، رسولوں کی تکذیب کی تو ہم نے ان کو غرق کر دیا۔ اور (آنے والے) انسانوں کے لئے ایک مثال بنا دیا۔ اور ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے، ظالموں کے لئے دردناک تباہی کا عذاب تیار رہتا ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اس قوم کی طرف سے تکذیبِ رسل ان کی غرقابی سے پہلے ہو چکی تھی (یعنی یہ نہیں کہ قومِ نوحؑ کے بقیہ افراد کی آیندہ نسلوں نے تکذیبِ رسل کی تھی جس کی طرف مندرجہ صدر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے) یہ بھی ممکن ہے کہ خود حضرت نوحؑ کے زمانہ میں اس قوم کے مختلف حصوں میں بیک وقت بہت سے حضرات مرسلین تشریف لائے ہوں (جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ ایک ہی وقت میں مبعوث ہوئے تھے) بہرحال یہ رسول حضرت نوحؑ سے پیشتر مبعوث ہوئے ہوں یا آپ کے ہم عصر ہوں، قرآن سے یہ ظاہر ہے کہ غرقابیٔ قومِ نوحؑ کے وقت ان کی قوم بہت سے رسولوں کی تکذیب کر چکی تھی اور بعثتِ حضرت نوحؑ کے وقت ان کی قوم کی حالت یہ تھی کہ وہ اللہ کے قوانین کے خلاف زندگی بسر کرتی تھی۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا فَاسِقِينَ (۵۱/۴۶)

اور اس سے قبل نوحؑ کی قوم تھی۔ وہ لوگ قانونِ خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے تھے۔

اور جیسا کہ ظاہر ہے اس فسق و عصیان کا نتیجہ سرکشی اور ظلم تھا۔

وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ (۵۳/۵۲)

اور اس سے قبل نوحؑ کی قوم کے لوگ سرکش اور ظالم تھے۔

اور ان لوگوں نے خدائے واحد کی معبودیت کو چھوڑ کر کھلی ہوئی بت پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ جب حضرت نوحؑ نے انہیں خدائے واحد کی طرف دعوت دی تو ان کی قوم کے سرغنوں نے، قوم سے کہا کہ

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا (۷۱/۲۳)

انہوں نے کہا اپنے معبودوں کو مت چھوڑو اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور نسر دیوتا کے بتوں کو مت ترک کرو۔

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر حضرت نوحؑ تشریف لائے۔ آپ نے ان لوگوں کو سب سے پہلے خدائے واحد کی معبودیت اختیار کرنے کی دعوت دی کہ یہی پیغام حضرات انبیاء کرام کی دعوت کا سنگِ بنیاد ہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ (۷/۵۹)

یہ واقعہ ہے کہ ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف (تبلیغِ حق کے لئے) بھیجا تھا۔ اس نے کہا: "اے میری قوم اللہ ہی کی محکومیت اختیار کرو اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔"

طلوعِ اسلام میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجے

اسلام کی سرگذشت

(۲)

حجاز کے جنوب میں ملک یمن ہے جو جزیرہ کے مغربی اور جنوبی کونہ پر مشتمل ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ سرسبزی اور دولت مندی میں شہرۂ آفاق رہا ہے۔ اس کے مشہور ترین شہروں میں شہر صنعاء ہے جو پرانے زمانہ میں شاہانِ یمن کا پایۂ تخت تھا۔ اس کے قریب ہی غُمدان کا مشہور محل ہے۔ اس کے جنوب مشرقی کونہ میں شہر مارب ہے جو قوم سبا کا مسکن تھا۔ اسی طرح یمن کے شہروں میں سے نجران اور عدن بھی ہیں۔ قدیم زمانہ میں یمن کے باشندوں کے تعلقات ہندوستان اور مشرق قریب کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔

یمن کے مشرق میں حضرموت کا کوہستانی سلسلہ ہے۔ اس میں بہت پہاڑ اور بہت وادیاں ہیں جس میں برباد شدہ شہروں کے کھنڈرات ملتے ہیں جن پر خطِ مسند میں لکھے ہوئے کتبات بھی ملتے ہیں۔

حضرموت کے مشرق میں "ظفار" ہے جو قدیم زمانہ سے مصالحوں اور خوشبوؤں کی برآمدی منڈی رہا ہے۔ یہاں سے عبادت گاہوں کی دھونی کے لئے خوشبودار چیزیں برآمد کی جاتی تھیں اور آج تک کی جاتی ہیں جو یہاں سے ہندوستان وغیرہ بھیجی جاتی ہیں۔

جزیرہ کے جنوب مشرقی کونہ میں عُمّان واقع ہے جو سمندر کے کنارہ پر ایک پہاڑی ملک ہے۔ قدیم زمانہ سے اس کے باشندے ملاحی کے فن میں ماہر مانے جاتے رہے ہیں۔ عمان کے شمال مغربی حصہ میں بحرین کا ملک واقع ہے جو حدودِ عراق تک پھیلتا چلا گیا ہے۔

وہ بلند حصہ جو حجاز کے پہاڑوں سے لے کر مشرق کی طرف صحرائے بحرین تک چلا گیا ہے نجد کہلاتا ہے۔ یہ بلند اور کشادہ ملک ہے۔ اس میں صحرا بھی ہیں اور پہاڑ بھی۔ منتشر طور پر یہاں کھیتی باڑی کے قابل ..... زمینیں بھی ملتی ہیں ملک عرب میں ہوا کے لحاظ سے یہ بہترین اور صالح ترین حصہ ہے نجد اور یمن کے درمیان "یَمَامَہ" ہے جو مشرق میں بحرین کے ساتھ اور مغرب میں حجاز کے ساتھ مل جاتا ہے اسے "عَرُوْض" بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ یمن اور نجد کے درمیان میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طسم اور جدیس کا ملک ہے۔ یہیں سے مسیلمہ کذاب نے خروج کیا تھا۔

یمامہ اور تہامہ کی سرحد کے قریب ہی عکاظ ہے جو عرب کا مشہور بازار تھا۔

جزیرۂ عرب کا موسم ...... عام طور پر ...... گرم ملکہ سخت گرم ہے۔ گرمی میں بلند مقامات پر راتیں معتدل ہوتی ہیں اور سردیوں میں پانی جم جاتا ہے۔ اس کی عمدہ ترین ہوا مشرقی ہوائیں ہوتی ہیں جنہیں وہ صَبا کہتے ہیں۔ اکثر شعراء نے ان ہواؤں کی مدح سرائی کی ہے۔ اس کے برعکس بدترین ہوا ہوائے سموم (لُو) ہے۔ اس ملک کا بہترین زمانہ موسم بہار کا ہوتا ہے جو بارشوں کے موسم کے بعد ہوتا ہے جس میں گھاس اور چارہ اُگ آتا ہے اور اونٹ اور بکریاں اسے چرتی ہیں۔

اس جزیرہ کے باشندے عرب کہلاتے ہیں۔ بعض محققین اس طرف گئے ہیں کہ عرب اور ان کے اردگرد کے لوگ سب ایک ہی اصل سے تھے۔ لیکن اردگرد کے لوگ متمدن بنتے چلے گئے اور عرب پیچھے رہ گئے۔ چنانچہ فُرات کے باشندے متمدن ہو گئے۔ وادیٔ نیل کے باشندے متمدن ہو گئے مگر عربوں پر بدویت ہی غالب رہی کیونکہ یہ لوگ پہاڑوں اور سمندروں میں گھرے ہوئے تھے۔

یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو، مگر یہ واقعہ ہے کہ اہلِ عرب اپنے اردگرد کے لوگوں سے تمدن اور تہذیب میں بہت پیچھے رہ گئے اور ان پر بدویت ہی غالب رہی۔ اکثر عربوں کی معیشت خانہ بدوش قبائلی معیشت تھی جو کسی جگہ جم کر نہیں رہتے تھے اور جہاں رہتے تھے اس جگہ سے انہیں کوئی مستحکم وابستگی نہیں ہوتی تھی جیسا کہ زراعت پیشہ اقوام کو ہوتی ہے۔ یہ لوگ بارش کے موسموں کا انتظار کرتے رہتے تھے اور اپنی کل کائنات، عورتوں اور اونٹوں کو لے کر چراگاہوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے تھے اور اپنے طبعی احوال وظروف کی تنظیم پر عقلی کوششیں صرف نہیں کرتے تھے جیسا کہ متمدن قومیں کرتی ہیں بلکہ آسمان و زمین جو کچھ کر دیتے تھے اس پر ان کا بھروسہ تھا۔ بارش برس گئی تو جانوروں کو چرا لیا، نہیں برسی تو تقدیر کے منتظر رہے۔ اس قسم کی معیشت نہ قوموں کو ترقی سے روشناس کر سکتی ہے اور نہ ہی تمدن کے گہواروں تک پہنچا سکتی ہے بلکہ تمدن کے گہواروں تک پہنچانے والی معیشت تو ایک جگہ جم کر رہنے اور احوالِ معیشت کو منظم کرنے میں عقل سے کام لینے کی زندگی ہی ہو سکتی ہے۔

تمام جزیرۂ عرب میں اس بدوی طرزِ معیشت ہی کا طوطی بولتا تھا۔ اگرچہ وہاں یمن کے علاقوں کی طرح کچھ تھوڑے سے علاقے متمدن بھی تھے۔

یہ بدو اور ان کے امثال قبائل میں منقسم تھے۔ قبیلہ ہی وہ وحدت ہوتی تھی جس پر ان کا پورا نظامِ اجتماعی مبنی ہوا کرتا تھا۔ یہ قبائل ہمیشہ باہمی نزاع میں گرفتار رہتے تھے۔ کبھی ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ یا مختلف قبائل سے دوستی کر لیتا تھا تاکہ دوسرے قبیلہ پر غارت گری کر سکے یا اس کی غارت گری کا جواب دے سکے یا اور اسی قسم کی دوسری اغراض ہوا کرتی تھیں۔ صدیاں گذر جاتی تھیں اور متحد قبائل اپنے ناموں اور شخصیتوں کو بھول جاتے تھے اور کسی ایک نام کے ماتحت منضم ہو جاتے تھے جو ان میں سے قوی ترین قبیلہ کا نام ہوتا تھا پھر آگے چل کر وہ یہ گمان کر لیتے تھے کہ وہ سب ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔

مورخین نے قبائل کے نسب ناموں اور ان کی شاخوں کی طرف توجہ کی اور اس موضوع پر کتابیں تصنیف کر ڈالیں۔ لیکن یہ نسب نامے مجموعی طور پر شک وشبہ کی زد میں رہے ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے۔ امام مالکؒ سے اس شخص کے متعلق پوچھا گیا جو اپنا نسب آدم تک بیان کرتا ہے۔ امام مالکؒ نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا۔ "اسے یہ کہاں سے معلوم ہو سکتا ہے؟" پھر ان سے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تک نسب بیان کرنے کے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کا بھی انکار کیا اور فرمایا کہ "اسے یہ کون بتا سکتا ہے؟"

نسب نگار حضرات یہ کہنے کے عادی سے ہو گئے ہیں کہ شمال میں رہنے والے عرب حضرت اسمٰعیل بن ابراہیم علیہما السلام کی نسل سے ہیں۔ اور جنوب کے رہنے والے عرب یقطان یا قحطان کی نسل سے ہیں۔ اس عقیدہ کا سرچشمہ تورات کا وہ بیان ہے جو سفر تکوین میں آیا ہے۔ چنانچہ عادۃً اہلِ جنوب کو یمنیین یا قحطانیین کہا جاتا ہے اور اہلِ شمال کو عدنانیین، نزاریین یا معدیین کہا جاتا ہے ہمیں اس وقت اس تقسیم کی صحت کی بحث سے سروکار نہیں بلکہ جو کچھ ہمیں یہاں بتانا ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں قسموں میں مختلف وجوہ سے کچھ حقیقی اور واقعی فرق ہیں۔

(اوّل) قسم جنوبی کی معیشت ایک جگہ جم کر سکونت اختیار کرنے کی تھی اور اس پر تمدن کا غلبہ تھا وَلَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَن يَمِينٍ وَشِمَالٍ كُلُوا مِن رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُورٌ (درحقیقت قوم سبا کے لئے ان کے مسکن ہی میں ایک نشانی تھی۔ دائیں بائیں دو باغات۔ کہ اپنے نشوونما دینے والے کے رزق سے کھاتے رہو اور اس کا شکر کرتے رہو۔ عمدہ شہر اور ان کا نشوونما دینے والا انہیں ہر قسم کے سامانِ حفاظت دینے والا بھی تھا) ان کے برعکس اہلِ شمال پر بدوی معیشت اور خانہ بدوشانہ زندگی غالب تھی۔

(دوم) ان دونوں کی زبان بھی مختلف تھی۔ یمن کی زبان حجاز کی زبان سے اپنی وضع قطع میں الگ تھی جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ یمنی زبان کا زیادہ تر ارتباط حبشی اور اکادی زبانوں سے تھا۔ اور حجاز کی زبان کا زیادہ تر ارتباط عبرانی اور نبطی زبانوں سے تھا۔ (سوم) ثقافتِ عقلی کے درجہ میں بھی اپنی بدوی اور تمدنی زندگی اور زبان اور مختلط قوموں کے اختلاف کے ماتحت بڑا اختلاف تھا۔

اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ دونوں شاخیں بالکلیہ ایک دوسرے سے الگ تھیں اور یہ کہ ان کی ہر شاخ اپنے شہروں ہی میں رہتی تھی اور دوسری شاخ سے نہیں ملتی تھی بلکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ اسلام سے پہلے اکثر اہلِ یمن حجاز کی طرف آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور بہت کم حجازی یمن میں جا کر آباد ہوئے۔ حجاز کی طرف اہلِ یمن کی آبادکاری کا سبب مورخین نے یمن میں مأرب کی سد کے منہدم ہو جانے کی بنا پر اس ملک کے باشندوں کا جزیرہ کے اطراف واکناف میں پھیل جانا قرار دیا ہے۔ بعض مورخین کا یہ خیال بھی ہے کہ ان اسباب میں سے جو اس ہجرت کا باعث ہوئے ایک بڑا سبب یمن کا تجارتی ضعف واضمحلال بھی ہے جو تیسری اور چوتھی صدی قبل مسیح میں اس تجارتی فروغ کے بعد پیدا ہوا جسے اہلِ روم نے بحرِ احمر میں قائم کر لیا تھا جو یمن کی تجارت پر ایک زبردست حملہ تھا۔ رہ گئی اہلِ شمال کی ہجرت جنوب کی طرف تو اس کی وجہ قبیلہ کی نسل کا بڑھ جانا اور وطن کی سرزمین کی تنگی ہوتی تھی جو انہیں سفر پر آمادہ کر دیتی تھی۔

مجلسِ اقبال

(۲)

سابقہ اشاعت میں ہم اپنی طرف سے لکھ چکے ہیں کہ اقبالؒ کے نزدیک خودی سے مفہوم کیا تھا۔ اشاعتِ حاضرہ میں اب یہ دیکھئے کہ حضرت علامہ نے خودی کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں کس طرح سمجھایا تھا۔ یہ چیز انہوں نے اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھی تھی (جو بعد کے ایڈیشن میں شائع نہیں ہوئی)۔ ہم اس دیباچہ کو جنسہٖ شائع کرتے ہیں۔ وھو ھذا۔

دیباچہ اسرارِ خودی

یہ وحدتِ وجدانی یا شعور کا روشن نقطہ جس سے تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پُراسرار شے جو فطرتِ انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ یہ "خودی" یا "انا" یا "میں" جو اپنے عمل کی رُو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رُو سے مضمر ہے۔ جو تمام مشاہدات کی خالق ہے۔ مگر جس کی لطافت مشاہدہ کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لاسکتی کیا چیز ہے؟ کیا یہ ایک لازوال حقیقت ہے یا زندگی نے محض عارضی طور پر اپنی فوری عملی اغراض کے حصول کی خاطر اپنے آپ کو اس فریبِ تخیل یا دروغِ مصلحت آمیز کی صورت میں نمایاں کیا ہے؟ اخلاقی اعتبار سے افراد و اقوام کا طرزِ عمل اس نہایت ضروری سوال کے جواب پر منحصر ہے اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہوگی جس کے حکما اور علما نے کسی نہ کسی صورت میں اس سوال کا جواب پیدا کرنے کے لئے دماغ سوزی نہ کی ہو۔ مگر اس سوال کا جواب افراد و اقوام کی دماغی قابلیت پر اس قدر انحصار نہیں رکھتا جس قدر ان کی افتادِ طبیعت پر۔ مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اسی نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے۔ اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔ مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کی طرف ان کی فطرت متقاضی تھی۔ ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے۔ اس قوم کے موشگاف حکما نے قوتِ عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انا کی حیات کا یہ مشہود تعطل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے عمل سے متعین ہوتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریقِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور جب تک یہ قانونِ عمل اپنا کام کرتا رہے گا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے۔ انیسویں صدی کے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ جب انجیلِ یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے ("ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا") تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتے کو دیکھتی ہے جس کو ہندو حکما نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت یا بالفاظِ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی دادِ تحسین کی مستحق ہے اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب انا کی تعیین عمل سے ہے، تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترکِ عمل ہے۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدد پیدا ہو جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ بنی نوعِ انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک نہایت دلفریب پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں ہے کیونکہ عمل اقتضائے فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مُراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دلبستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی رستے پر چلے مگر افسوس ہے کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔

مغربی ایشیا میں اسلامی تحریک بھی ایک نہایت زبردست پیغامِ عمل تھی گو اس تحریک کے نزدیک انا ایک مخلوق ہستی ہے جو عمل سے لازوال ہوسکتی ہے مگر مسئلۂ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ وحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعرا اس رنگ میں رنگین ہو گئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہو سکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے انہوں نے جزو اور کل کا دشوار گذار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا بلا واسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکما نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا۔ مگر ایرانی شعرا نے اس مسئلہ کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انہوں نے دل کو اپنا آماجگاہ بنایا اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخرکار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علمائے قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکما میں واحد محمود نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر افسوس ہے کہ واحد محمود کی تصانیف آج ناپید ہیں۔ مُلّا محسن فانی کشمیری نے اپنی کتاب دبستانِ مذاہب میں اس حکیم کا تھوڑا سا تذکرہ لکھا ہے جس سے اس کے خیالات کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ابن تیمیہ کی زبردست منطق نے کچھ نہ کچھ اثر ضرور کیا۔ مگر حق یہ ہے کہ منطق کی خشکی شعر کی دل رُبائی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

شعرا میں شیخ علی حزیں نے یہ کہہ کر کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ حقیقتِ حال سے آگاہ تھے۔ مگر باوجود اس بات کے ان کا کلام شاہد ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ان حالات میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ ہندوستان میں اسلامی تخیل اپنے عملی ذوق کو محفوظ رکھ سکتا۔ مرزا بیدل علیہ الرحمۃ لذتِ سکون کے اس قدر دل دادہ ہیں کہ ان کو جنبشِ نگاہ تک گوارا نہیں۔

نزاکت ہاست در آغوشِ مینا خانۂ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور امیر مینائی مرحوم یہ تعلیم دیتے ہیں کہ

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول
آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لئے ان کے ادبیات و تخیلات اہلِ مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضیات کے طریقِ استدلال سے پختہ کیا گیا تھا دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔ سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہو گئے جس طرح رنگ بو وغیرہ کے لئے مختص حواس ہیں اسی طرح انسانوں میں ایک اور حاسہ بھی ہے جس کو حسِ "واقعات" کہنا چاہیئے۔ ہماری زندگی واقعاتِ گرد و پیش کے مشاہدہ کرنے اور ان کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو اس قوت سے کام لیتے ہیں جس کو میں نے حسِ واقعات کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ نظامِ قدرت کے پُر اسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ جن کو نظریات کے دل دادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بہ نگاہِ حقارت دیکھتے ہیں اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنجِ گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں "حسِ واقعات" اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

عورت کا قرآن

قرآن کریم پوری نوع انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور چونکہ نوع انسانی میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں اس لئے اس کی راہ نمائی ان دونوں کے لئے ہے۔ اس راہ نمائی میں بیشتر امور تو ایسے ہیں جو مرد اور عورت دونوں سے یکساں طور پر متعلق ہیں لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جو صرف مردوں سے متعلق ہیں اور بعض ایسے جن کا تعلق صرف عورتوں سے ہے۔ یہ امور جو خصوصیت سے عورتوں سے متعلق ہیں قرآن کی مختلف آیات میں بکھرے پڑے ہیں۔ محترمہ جمیلہ خاتون نے (جنہیں طلوع اسلام سے دیرینہ اور گہری دلچسپی ہے) عورتوں سے متعلق قرآنی تعلیم کو ایک کتابی شکل میں یکجا اور مربوط کر دیا ہے اور اپنی اس کتاب کا نام رکھا ہے "عورت کا قرآن" مطلب اس سے یہ ہے کہ جب ایک عورت قرآن کریم کا مطالعہ کرتی ہے تو وہ اس میں اپنے متعلق کیا کچھ لکھا پاتی ہے۔ چونکہ طلوع اسلام کے حلقہ میں خواتین کی تعداد کچھ کم نہیں اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں ان کی دلچسپی بھی بڑی گہری ہے، اس لئے ان کا ایک عرصہ سے تقاضا تھا کہ طلوع اسلام میں ایک مستقل عنوان "عورتوں" سے بھی متعلق ہونا چاہئے۔ ماہنامہ طلوع اسلام میں اس کی گنجائش نہ تھی لیکن اب جو یہ ہفتہ وار شائع ہو رہا ہے تو ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان واجب الاحترام خواتین کا دیرینہ تقاضا پورا کیا جا سکے۔ اس کے لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ قرآن کریم نے جو کچھ عورتوں کے متعلق کہا ہے اسے ایک عورت ہی کی زبان سے پیش کیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ہم نے محترمہ جمیلہ خاتون کی مذکورہ صدر کتاب کا انتخاب کیا ہے۔ یہ کتاب ابھی تک کہیں نہیں چھپی صرف مسودہ کی شکل میں ہے۔ مندرجہ صدر مستقل عنوان (عورت کا قرآن) کے ماتحت یہ مسلسل شائع کیا جائے گا۔ اس ضمن میں اگر کوئی بات وضاحت طلب ہو تو محترمہ جمیلہ خاتون پالوی۔ چھپرہ۔ بہار۔ انڈیا۔ (یعنی بھارت) سے براہ راست دریافت کر لی جائے۔ امید ہے حلقۂ طلوع اسلام کی خواتین طلوع اسلام کی اس کوشش کو خصوصیت سے مفید پائیں گی۔ سب سے پہلے کتاب کا "پیش لفظ" درج کیا جاتا ہے۔

(طلوع اسلام)

پیش لفظ

فریاد حافظ ایں ہمہ آخر بہرزہ نیست
ہم قصۂ عجیب و حدیثے غریب ہست

اللہ جانے اس کرۂ ارض پر "اشرف المخلوقات" کی آبادی کی ابتدا کب سے ہوئی؟ جب سے بھی ہوئی ہو، جب ہی سے "عورت" پر قہر ٹوٹنا شروع ہوا۔ صدیوں پر صدیاں گزرتی رہیں مگر "عورت" بدستور پامال و خستہ حال رہی، ہمیشہ محزون و ملول رہی۔ پیغمبر پر پیغمبر آتے رہے، ہر اُمت میں آتے رہے ہر مقام پر آتے رہے:

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا (نحل ۵)

اور ہم ہر اُمت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور بھیجتے رہے ہیں۔

(۲) ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا ...... فَأَتْبَعْنَا بَعْضَهُم بَعْضًا (مومنون ۳)

پھر ہم نے اپنے پیغمبروں کو یکے بعد دیگرے بھیجا...... سو ہم نے ایک کے بعد ایک کا نمبر لگا دیا۔

(۳) وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر ۳)

اور کوئی بھی اُمت ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں کوئی نہ کوئی (بدعملی کے نتائج سے) ڈرانے والا نہ گذرا ہو۔

(۴) وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (ابراھیم ۱)

اور ہم نے تمام پیغمبروں کو ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کے بھیجا تاکہ وہ ٹھکانے سے اُن سے گفتگو کر سکیں۔

اور ہر پیغمبر ایک خاص شریعت اور احکام لے کر آتے رہے:-

(۱) لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا (مائدہ ۷)

تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے خاص شریعت اور خاص منہاج تجویز کی تھی۔

(۲) لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (رعد ۶)

ہر زمانے کے مطابق خاص خاص احکام ہوتے ہیں۔

مگر نہ تو حضرت نوحؑ کی صدیوں کی تبلیغ نے "عورت" کو کوئی زندگی بخشی اور نہ حضرت ہودؑ و صالحؑ کی جاں کاہیوں نے اسے راحت پہنچائی۔ نہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت نے "عورت" کو قابلِ اعتنا سمجھا اور نہ حضرت اسمٰعیلؑ کی سیادت نے اسے سکون عطا کیا۔ نہ حضرت موسٰیؑ کی جلالت "عورت" کو مصیبت سے چھڑا سکی اور نہ حضرت سلیمانؑ کی سطوت نے اس کی نزاکت پر ترس کھایا۔ نہ حضرت زکریاؑ کی موعظت "عورت" کو پناہ دلا سکی اور نہ حضرت عیسٰیؑ کی حذاقت نے اس کے درد کی دوا کی[1]۔ نہ کرشن جی کا نغمہ "عورت" کا غم بھلا سکا نہ کنفیوشس کی عظمت اس کے آڑے آئی۔ "عورت" جانکنی کے جس عالم میں چلی آتی تھی بدستور رہی اس پر ستم کے پہاڑ جس طرح ٹوٹتے تھے ویسے ہی ہمیشہ ٹوٹتے رہے۔ "کتاب پر کتاب" اترتی رہی۔ ہر زبان میں اُترتی رہی۔ ہر پیغمبر کے ساتھ اُترتی رہی:-

(۱) فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ (بقرہ ۲۶)

پھر اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا جو ایمان و عمل کے اجر کی خوشخبری سناتے اور کفر و بدعملی کی سزا سے ڈراتے تھے۔ اور ان نبیوں کے ساتھ کتابیں بھی سچائی کے ساتھ نازل کیں۔

(۲) لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۳)

بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو کھلے کھلے احکام دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتابیں نازل کیں اور انصاف کی ترازو بھی تاکہ وہ لوگ اعتدال پر قائم ہوں۔

مگر یہودیت کے صحائف (تورات) ہوں یا عیسائیت کی (اناجیل) زرتشت کی "اوستا" اور "دساتیر" ہوں یا ہندومت کی "گیتا" "رامائن" "وید" "شاستر" اور "پران" بدھ مت کی "سنتہ" "ونایا" اور "ابھے دھما" ہوں یا جین مت کی "سیرو" اور "انگ" چینیوں کے کنفیوسش ازم کی "شوکنگ" "شیہ کنگ" "ای" "لیکی" "کھونکھیو" اور "ہیاس کنگ" ہوں یا جاپانیوں کے "شنٹو ازم" کی "کوجی کی" اور "نیہو گی" "عورت" کے لئے کوئی کتاب بھی سینہ سپر نہ ہو سکی۔ اس کو کسی صحیفے نے بھی سہارا نہ دیا۔ تا آنکہ مکہ کی مقدس سرزمین پر، قبیلۂ بنو زہرہ کی ایک دردمند عورت کے منور آغوش کو، اُس پیکرِ نور نے زینت بخشی، جسے دنیا کا سب سے بڑا انسان اخلاق کا سب سے اعلیٰ نمونہ، مظلوموں کا سب سے بڑا فریادرس، بیکسوں کا سب سے بڑا سہارا، غلاموں کا سب سے بڑا حامی اور یتیموں کا سب سے بڑا والی کہا جا سکتا اور کہا جاتا ہے اور جس پر "دین اسلام" کے دستور العمل "قرآن مجید" نے نزول اجلال فرمایا۔ "عورت" کے درد کا سب سے پہلا اور آخری نسخہ ہے:-

(۱) لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ ۱۶)

تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری ہی جنس سے ہیں۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

---

[1] یعنی ان انبیائے کرام کی طرف منسوب کردہ کتابیں جو اس وقت ہمارے پاس ہیں ان میں عورت کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں ملتا۔ ان کی اصلی تعلیم میں تو یہ مداوا ضرور موجود ہوگا۔

انڈونیشیا

پس منظر و پیش منظر

آزادی کے پانچ سالوں کے بعد انڈونیشیا عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کا ابتلا سیاسی بھی ہے معاشی بھی اور جذباتی بھی۔ اہل انڈونیشیا کے قلوب میں متضاد جذبات کا ہیجان ہے۔ وہ ہالینڈ سے نفرت کرتے ہیں، چین کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اشتراکیت سے ڈرتے ہیں اور امریکہ اور آسٹریلیا سے مایوس ہیں۔ اس سے ملک میں غیر ملکیوں کے خلاف ایک عام فضا پیدا ہوگئی ہے جو سیاسی ہونے کی بجائے نظری ہے اور جس کی وجہ سے جذبہ قومیت متشدد ہوگیا ہے۔ اس اشتداد سے نظم و ضبط ختم ہوگیا ہے اور جذباتی عدم توازن بڑھ گیا ہے۔ اس پس منظر میں جو افراتفری مچ سکتی ہے اس کا تصور اہل نظر و بصیرت کے لئے مشکل نہیں۔

شاید تضادات انڈونیشیا کے خمیر میں ہی موجود تھے۔ فطرت اور انسان دونوں نے انڈونیشیا کو عجائبات و تضادات کی سرزمین بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ یہ عمل لکھوکھا سالوں سے جاری ہے اور اس کا اثر گلہائے رنگارنگ کی شکل میں ہر طرف بکھرا ملتا ہے جو اس چمن کی زینت ہیں۔ انڈونیشیا کہنے کو ایک ملک ہے لیکن درحقیقت یہ ایک مجمع الجزائر ہے۔ اس کے چھوٹے بڑے جزیروں کی کل تعداد تین ہزار ہے جو کم و بیش تین ہزار میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی آبادی پاکستان کے لگ بھگ اور مجموعی طور پر تھائی لینڈ (سیام)، برما، ملایا اور ہند چینی کے برابر ہے۔ اس کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ ایک سال میں تین تین چار چار فصلیں پیدا کر سکتی ہے۔ مصالحوں، ربڑ، کونین وغیرہ کے لئے یہ علاقہ خصوصیت سے مشہور ہے۔ اور پرانے زمانے سے "معالجوں کے جزیرے" کے نام سے موسوم چلا آرہا ہے۔ قدرت کی اس بے مثل فیاضی کا اہل ملک کو بہت کم فائدہ پہنچا ہے اور اس کی دولت کا بہاؤ اکثر بیرون ملک ہی رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انڈونیشیا کے "نور دیدہ" نے ہمیشہ "چشم زلیخا" ہی کو روشن کیا ہے۔ اب جبکہ تاریخ اس موڑ پر پہنچی ہے کہ اس کے آٹھ کروڑ باشندے آزادی سے ہمکنار ہوئے ہیں تو یہ "سونے کی چڑیا" ملک معاشی تباہی کے قریب پہنچ چکا ہے!

معاشی تباہی

یہ تباہی کیسے واقع ہوئی؟ اس کا جواب دینے کے لئے گذشتہ پنج سالہ دورِ آزادی کا مطالعہ ضروری ہے۔ انڈونیشیا، کوئی نصف صدی کی جدوجہد کے بعد بڑے جانگسل مراحل سے گذرتا ہوا، ۲۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہالینڈ کے استعماری چنگل سے رہا ہو کر آزاد جمہوریہ بنا۔ حصولِ آزادی کے بعد اس عظیم ملک کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کی پیدائش تو خیر صبر آزما تھی ہی، پیدائش کے بعد اس کا زندہ رہنا جان جوکھوں کا کام ہوگیا۔ ابھی ہالینڈ کے تصرف سے گلوخلاصی نہیں ملی تھی کہ مرکزی جاوا میں اشتراکی بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔ انڈونیشی حکومت نے بڑی مستعدی اور سختی سے اسے فرو کیا لیکن بدامنی اور لاقانونیت کے دیو کو پوری طرح قابو میں نہ لایا جاسکا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور فتنہ برپا ہوگیا۔ جو "دارالاسلام" کا کھڑا کیا ہوا تھا۔ اس تحریک نے اسلام کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ کئی بے کار آزادی کے سابق سپاہی ڈاکو اور لٹیرے بن گئے اور دہشت انگیزی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ یہ فتنہ ابھی تک فرو نہیں ہوسکا اور آج بھی اس کی طرف سے ملک کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی نہیں جاتی۔ ان کے ہاتھوں گاؤں کے گاؤں نیست و نابود ہو رہے ہیں، گو بیرون ملک اور بعض اوقات خود جکارتا مرکز جمہوریہ میں اس کی خبر تک نہیں پہنچتی۔

اس وقت انڈونیشیا میں تین باغی تحریکیں چل رہی ہیں جو جکارتا کی مرکزی حکومت کے لئے دردِ سر بنی ہوئی ہیں۔ کم و بیش ایک لاکھ فوجی سپاہی ان کے فرو کرنے پر مامور ہیں۔ "دارالاسلام" کا لیڈر کارتوسورجو ہے اور اس کا زور زیادہ تر مغربی اور وسطی جاوا، جنوب مشرقی بورنیو، جنوبی سیلیبیز اور شمالی سماٹرا میں ہے۔ اندازاً بیس ہزار مسلح افراد ان کے پیچھے ہیں جو لٹیروں کی طرح لوٹ مار کرتے ہیں اور دہشت انگیزی پھیلاتے ہیں انہوں نے دور دور تک وسیع علاقوں میں اودھم مچا رکھا ہے اور تباہی پھیلا رکھی ہے۔ وہ نظم حکومت کی ہر کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کا سیاسی حلقوں میں کافی اثر و دخل ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ابھی تک کسی حکومت نے بھی ان کے خلاف کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھایا۔ جنوبی ملاکس میں سومیکیل مصروفِ عمل ہے۔ وہ ایک قانون دان ہے جو ہالینڈ کی مدد سے انڈونیشیا کے مشرقی جزائر میں "آزاد جمہوریہ" قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ جزائر مغربی نیوگنی کے قریب ہیں۔ مغربی نیوگنی بدستور ہالینڈ کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ حالانکہ اقتدار سے دستبردار ہوتے وقت اس نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے مستقبل کے متعلق انڈونیشیا سے علیحدہ معاہدہ کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ آج تک طے نہیں ہوسکا کیونکہ ہالینڈ جملہ مذاکرات کو بہ لطائف الحیل ناکام بنا دیتا رہا۔ مغربی سیلیبیز میں ایک اور باغی مذکر نامی آزاد حکومت قائم کرنے کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس کے کوئی دس ہزار پیرو ہیں۔

بدامنی اور لاقانونیت کی ان تحریکوں کے ہوتے ہوئے انڈونیشی حکومت کی مشکلات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ متعدد حکومتوں نے اس بدامنی کا مسلسل اور پامردی سے مقابلہ کیا ہے اور یہ غنیمت ہے کہ انہیں قابو میں لایا جا رہا ہے۔ لیکن امن و امان کی مکمل بحالی کے لئے انڈونیشیا کو ابھی بڑی جدوجہد کرنا پڑے گی۔ وہ نوجوان جو جنگ آزادی میں گوریلا جنگیں لڑتے رہے اور اب بدقسمتی سے راہزنوں کے ہتھے چڑھ کر قتل و نہب میں مصروف ہیں، انہیں تخریب و غارت سے ہٹا کر تعمیر و ترقی کی طرف مائل کرنا بڑا دشوار کام ہے آزادی کے جو سابق سپاہی اس وقت حکومت کی ملازمت میں ہیں ان کا مسئلہ بھی عجیب ہے۔ انڈونیشیا کی فوج ۲ لاکھ کے برابر ہے۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو جاپان اور ہالینڈ کے خلاف لڑ چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ملازمت ان کی خدمات کا صلہ ہے۔ اس سے حکومت کے لئے مشکل ہوگیا ہے کہ وہ فوج میں ضرورت کے مطابق کمی کرے یا مکمل عسکری ضبط کا مطالبہ کرے۔ ایسا کرنے سے جگہ بہ جگہ غدر ہو جاتا رہا اور اب حکومت مصلحت اسی میں دیکھتی ہے کہ وہ پھونک پھونک کے قدم رکھے۔ یہ واضح رہے کہ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں فوج کے بعض عناصر نے غدر برپا کر دیا تھا اور پارلیمان پر "حملہ" کرکے اسے توڑنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس غدر کے لیڈروں سے کسی قسم کی بازپرس نہیں کی گئی تھی۔ فوج کی طرح دیگر ملازمتوں کا بھی یہی حال ہے۔ حکومت اب بھی مجبور ہے کہ ضرورت سے زائد ملازمین رکھے۔ اس کے علاوہ کلیدی آسامیوں پر برسراقتدار پارٹیوں کے نامزدگان کا قبضہ ہوتا ہے اور وہ من مانی کارروائیاں کرتے ہیں۔ عملہ بالعموم ناتجربہ کار ہے، تنخواہیں کم ہیں اور ملازمت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ملک میں گرانی بہت ہے اور روپے کی قیمت گری ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ملازمین حکومت بے دریغ رشوت لیتے ہیں۔ جو چند دیانتدار ہیں وہ بھی معاشی تنگی کی وجہ سے بددیانتی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاید ہی کوئی اسی کم تنخواہ پانے والا ملازم ملے گا جو قرض میں دبا ہوا نہ ہو، اور شاید ہی کوئی اعلیٰ ملازم ہوگا جو کسی نہ کسی مالی سودے میں حصہ دار نہ ہو۔ یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہر شخص یا تو ادھار پر گزارہ کرتا ہے یا رشوت پر۔

انڈونیشی نظم معیشت بری طرح تباہ کیا گیا ہے۔ کوریا کی لڑائی شروع ہونے پر اس ملک سے ربڑ اور ٹین خوب برآمد ہوئے اور اس سے خوب پیسہ کمایا گیا۔ لیکن یہ کروڑوں روپے کا زرمبادلہ بیکار سودوں میں ضائع کر دیا گیا! اس سے ملک کو کیا ملا؟ اعلیٰ نمائشی امریکی کاریں، ریل کے ایئرکنڈیشنڈ ڈبے، مسافر طیارے اور پرانا سامان جنگ! اس طرح ملک کے طلائی فاضلات جو ۱۹۵۲ء میں ۸۰ فی صدی تھے ۱۹۵۳ء کے وسط میں ۴۰ فی صدی تک گر گئے۔ ۱۹۵۴ء میں وہ کم سے کم قانونی حد یعنی ۲۰ فی صدی سے بھی کم ہوگئے۔ انڈونیشی روپے کی قیمت اس کی ظاہری قیمت کے مقابلہ میں کوئی ایک تہائی ہوگئی ہے اور غیر ملکی زرمبادلہ میں چور بازاری زوروں پر ہے۔ چنانچہ کاغذی نوٹوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اور اندازہ یہ ہے کہ امسال بجٹ میں کوئی ایک ارب روپے کا خسارہ ہوگا۔ غیر ملکی زرمبادلہ کی کمی سے تجارت درآمد و برآمد بھی درہم برہم ہوگئی ہے اور تاجر اکثر و بیشتر ناجائز تجارت سے ہی کام چلاتے ہیں تجارت زیادہ تر ولندیزی قبضے میں ہے اور اس کا سارا منافع ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔ حکومت ملکی تاجروں کو درآمدی اجازت نامے دینے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس سے چند در چند خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

بازیافت کی مساعی

انڈونیشیا کا معاشی بحران اور سیاسی ابتری دیکھ کر ترس

یہ صورتِ حال مایوس کن ضرور ہے لیکن امیدیں بالکل ختم نہیں ہوگئیں۔ بقول صدر سوئیکارنو کے الفاظ میں انڈونیشیا اپنی "بازیافت" کے لئے جرأت مندانہ اقدام کر رہا ہے۔ بغاوت اور بدامنی بیشک پریشانی کا باعث ہیں لیکن وہ اس اعتماد کو کچل نہیں سکے جو ایک انڈونیشی کے دل میں اپنے ملک کے استحکام سے متعلق جاگزیں ہے۔ ملک کی فضا بالعموم قومی فخر سے معمور ہے۔ مسٹر علی ساستروامی جوجو کی موجودہ حکومت شبانہ روز محنت کر رہی ہے کہ ملک اس بحران سے ابھرے۔ غذا میں انڈونیشیا خودکفیل ہو چکا ہے۔ تعلیم میں وہ تناسبِ خواندگی ۷ سے ۴۰ فی صدی تک لے گیا ہے۔ اور یہ کچھ صرف چھ سالوں میں کیا گیا ہے۔

انڈونیشیا کی سیاسی ناستواری بہت حد تک اس کے عارضی دستور کی شرمندۂ تخلیق ہے۔ گو اس میں ہالینڈ کی ریشہ دوانیوں کو کچھ کم دخل نہیں۔ جب موجودہ جمہوریہ معرضِ وجود میں آئی تو اس وقت ایک عبوری دستور مرتب کیا گیا اور ایک عارضی پارلیمان قائم کی گئی۔ یہ عارضی انتخابات تک برقرار رہے گا جو ابھی تک منعقد نہیں ہو سکے۔ لیکن توقع ہے کہ اس سال منعقد کئے جا سکیں گے۔ عارضی پارلیمان صدر کی نامزد تھی (خود صدر بھی عارضی تھے) اس کی ۲۱۰ نشستیں مختلف سیاسی جماعتوں اور نام نہاد گروہوں میں بطور حصہ رسدی تقسیم کی گئیں۔ اس کے ساتھ سیاسی پارٹیوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ وہ اپنے امیدواروں کو نامزد کریں اور موت اور استعفے وغیرہ کی صورتوں میں ان کی جگہیں اپنے نامزدگان سے پُر کرتی رہیں۔ جو جماعتیں پارلیمان کے اجزائے ترکیبی ہیں ان کی تعداد اٹھارہ ہے ان حالات میں کسی ایک پارٹی کے لئے یہ مشکل ہو گیا ہے کہ وہ تنہا اپنے زور پر حکومت مرتب کر سکے۔ یہی نہیں بلکہ اس سے چھوٹے چھوٹے گروہوں کی قدر بڑھ گئی ہے کیونکہ حکومت سازی میں وہ زیادہ کام آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا کی حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ گذشتہ چھ سالوں میں چھ حکومتیں بن چکی ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ موجودہ حکومت انتخاباتِ عمومی تک برقرار رہ سکے گی۔ حکومتوں کے شکست و ریخت کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ پارلیمان کا اعتماد کھو بیٹھتی ہیں۔ بلکہ جب کبھی کسی پارٹی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اسے کم عہدے ملے ہیں تو وہ مخلوط وزارت سے علیحدگی اختیار کر لیتی ہے اور بس حکومت ختم ہو جاتی ہے۔

انڈونیشی پارلیمان کے اجلاس بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں، کمرہ اجلاس کالج کے معمولی کمرہ کے برابر ہے اور ارکان اور زائرین کے مابین حدِ فاصل ایک رسی سے قائم کی جاتی ہے۔ وزراء ایک کونے میں اونچے چبوترے پر بیٹھتے ہیں۔ ارکان اور صدر بے تکلفی سے تمباکو نوشی کرتے ہیں اور تقریروں کے دوران میں چائے وغیرہ پیتے رہتے ہیں۔ حکومت کے حامی اور مخالف ارکان ملے جلے بیٹھتے ہیں جس سے رائے شماری میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ رائے شماری کے وقت ایک تختہ سیاہ لا کر صدر کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور جیسے جیسے ارکان ہاں یا نہ کرتے ہیں ایک اہلکار اس پر اعداد درج کرتا جاتا ہے۔

بین المللی رقابتیں

ہالینڈ نے انڈونیشیا کو کمزور اور غیر متحد رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہوں نے ان تاریخی نسلی امتیازات کو خوب ابھارا جو ملک میں پائے جاتے تھے اور "جاوی استعماریت" کا ہوا کھڑا کر دیا۔ یہ واضح رہے کہ انڈونیشیا کی آٹھ کروڑ کی آبادی میں چھ کروڑ صرف جاوا میں آباد ہے۔ جزیرہ سماٹرا جو جزیرہ جاوا سے رقبے میں دوگنا ہے، اس کی آبادی بمشکل ایک کروڑ ہے۔ انڈونیشیا کا پڑھا لکھا طبقہ جاوا میں ہے اور وہی قریباً ہر قسم کی کلیدی آسامیوں پر قابض ہے۔ حکومت کا مرکز، جکارتا، بھی جاوا ہی میں ہے۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے روایتی اصول سے کام لیتے ہوئے ولندیزیوں نے جان بوجھ کر "جاوی استعماریت" کا ڈھونگ کھڑا کیا۔ انڈونیشیا نے اس خطرے کو بھانپا اور آزادی ملتے ہی مضبوط مرکز کی وحدانی طرزِ حکومت کا اعلان کر دیا۔ ہالینڈ نے اسے غیر آئینی کہا مگر ملک نے اسے قبولیتِ عامہ کی سند عطا کی۔ البتہ بعض عناصر، جو زیادہ سے زیادہ، خود مختاری کے خواب دیکھ رہے تھے، اس سے مطمئن نہ ہوئے اور علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ حکومت ان کے فرو کرنے میں ابھی تک مصروف ہے۔ اس کی طرف سے اکثر کہا جاتا ہے کہ باغیوں کو ہالینڈ کی طرف سے سیاسی اور مادی مدد ملتی رہتی ہے۔ موجودہ وزیر اعظم، علی ساستروامی جوجو، نے کہا ہے کہ ہالینڈ کے ایجنٹ متعدد مرتبہ یہ جرم کرتے ہوئے پکڑے گئے مگر غیر ملکی پریس نے ان کی خبر تک شائع نہیں کی۔

ہو سکتا ہے کہ ۱۹۵۵ء انڈونیشیا کی زندگی میں اہم ترین سال ثابت ہو۔ توقع ہے کہ کئی التوائوں کے بعد اس سال کے دوران میں پہلی آزاد پارلیمان منتخب ہو جائے گی انتخابات کی اساس بالغ رائے دہندگی پر ہوگی۔ یہ بھی عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شاید انتخابات منعقد نہ ہو سکیں کیونکہ امن و امان کی بحالی ان پر مقدم ہے۔ انتخابات ہوں یا نہ ہوں، عام سیاسی نقشہ قریباً وہی رہے گا جو اب ہے۔ کہنے کو انڈونیشیا کے موجودہ حکمران منتخب نہیں ہیں لیکن وہ جنگِ آزادی میں پیش پیش رہے ہیں اور انہیں ملک میں بڑے احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اندریں حالات یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتخابات میں ان کی اکثریت کامیاب ہو جائے گی۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے گروہ ختم ہو جائیں اور تین یا چار بڑی سیاسی جماعتیں میدان میں رہ جائیں۔

احزابِ سیاسی

موجودہ عارضی پارلیمان میں قابلِ ذکر سیاسی جماعتیں زیادہ سے زیادہ پانچ ہیں۔ ان میں سب سے بڑی "پرتانی نیشنل انڈونیشیا" (PNI) ہے۔ اس کے قبضے میں ۴۲ نشستیں ہیں۔ دوسری "مسجومی" (مجلس شوریٰ مسلمین انڈونیشیا) ہے۔ اس کی ۴۰ نشستیں ہیں۔ تیسری انڈونیشیا کلاں پارٹی ہے۔ اس کی ۱۹ نشستیں ہیں اور یہ ابھی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ چوتھی پرتائی سوشلسٹ انڈونیشیا (PSI) دائیں بازو کی سوشلسٹ پارٹی جس کی ۱۴ نشستیں ہیں۔ پانچویں تانی کمیونسٹ پارٹی (PKI) ہے۔ اس کی اپنی ۱۴ نشستیں ہیں۔ لیکن اسے پانچ ٹریڈ یونین نشستوں کی بھی مدد حاصل ہے۔ جن پر کمیونسٹ قابض ہیں۔ اور تین "ہم سفروں" کی بھی۔ بقایا ۴۰ نشستیں متفرق گروہوں میں بٹی ہوئی ہیں جو وزارت سازی کے وقت بڑی جماعتوں سے مل جاتے ہیں۔

بڑی پارٹیوں میں سے نیشنلسٹ پارٹی سب سے زیادہ اہمیت کی مالک ہے۔ یہ ہر مخلوط وزارت میں شریک رہی ہے۔ اس کی ستائیس سال کی زندگی انڈونیشی جنگِ آزادی کا آئینہ ہے کیونکہ ڈاکٹر سوئیکارنو کی قیادت میں یہی جماعت سیاسی شعور پیدا کرنے کی ذمہ دار رہی ہے۔ آزادی کے بعد البتہ یہ جماعت بدنام ہونا شروع ہو گئی کیونکہ اس کے لیڈر قومی راستے سے ہٹ ہٹ کر ذاتی مفادِ عاجلہ کی طرف لپکنے لگے۔ پھر بھی یہ سب سے زیادہ منظم جماعت ہے اور اندرونِ ملک بائیں طرف کی سوشلسٹ پارٹی ہے اور بیرونِ ملک غیر جانبداری کی پابند۔

مسلم پارٹی

اس کے برعکس مسجومی ایک نئی جماعت ہے۔ اسے قائم ہوئے صرف نو سال ہوئے ہیں مگر اس قلیل مدت میں یہ PNI کی زبردست حریف بن گئی ہے۔ اس کی جماعتی تنظیم بہت بڑی ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے ارکان کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ یہ مسلمان جماعت ہے اور "اسلامی اصولوں پر مبنی جمہوری مملکت" کے قیام کی داعی ہے۔ یہ سراسر "اسلامی حکومت" کے حق میں اور نہ ہی "دار الاسلام" سے متعلق نہیں ــــ جو سراسر مذہبی حکومت بنانے کے حق میں ہے ــــ لیکن اس کے معترضین کا کہنا ہے کہ یہ در پردہ اس سے ملی ہوئی ہے اور دہشت انگیزی میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ خارجہ حکمتِ عملی میں یہ جماعت بھی ڈاکٹر سوئیکارنو کی جماعت کی طرح غیر جانبداری کی حامی ہے۔

سوشلسٹ پارٹی (PSI) کو سلطان شہریار کی قیادت حاصل ہے۔ ۱۹۴۸ء میں اس سے مارکسی نظریئے والے ارکان علیحدہ ہو گئے اور سابق وزیر اعظم ڈاکٹر شریف الدین ــــ جو بعد میں بغاوت کے جرم میں موت کی سزا کے مستوجب ہوئے ــــ کی قیادت میں PKI تشکیل کی۔ لیکن یہ پارٹی اس صدمہ کے باوصف زندہ رہی۔ خلاف کمیونسٹ ہونے کی بدولت اس کا تعاون مسجومی سے ہو جاتا ہے گو یہ حیران کن ضرور ہے۔ صدر سوئیکارنو نے حال میں ان پارٹیوں پر الزام لگایا کہ وہ غیر ملکی سرمائے سے ان کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں۔ یہ غیر ملکی مدد امریکہ کی سمجھی جاتی ہے۔ PKI یعنی کمیونسٹ پارٹی انڈونیشی سیاست میں خطرناک عنصر بھی ہے اور ناقابلِ یقین بھی۔

ہالینڈ نے انڈونیشیا کو استعماریت کی لعنت میں ہی مبتلا نہیں کیا بلکہ اشتراکیت کا تخم بھی ہالینڈ ہی کے ہاتھوں بویا گیا۔ انڈونیشیا استعماریت سے تو ایک حد تک گلو خلاصی حاصل کر چکا ہے لیکن اشتراکیت کا پودا برگ و بار لا رہا ہے اور وقت کا سنگین مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ پسماندہ انڈونیشی مارکسی نظریات سے بالکلیہ بے خبر تھے۔ انہوں نے شاید ہی کہیں اشتراکیت کا نام سنا ہوگا۔ البتہ کچھ تیس سال اُدھر کی بات ہے کہ ریلوے میں مزدوروں کا کچھ جھگڑا پیدا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں کئی ولندیزی اور یوریشین شریک تھے۔ ڈچ حکومت نے انہیں ماسکو کے نمائندے اور جھوٹ کہہ کر یاد کیا ان میں بعض اشتراکی خیالات ضرور رکھتے تھے لیکن حکومت نے انہیں جس طرح شہرت دی اس سے اشتراکیت کا چرچا ہونا شروع ہو گیا۔ تعلیم یافتہ انڈونیشی جب ان نظریات سے متعارف ہوئے تو ان میں انہیں بڑی جاذبیت نظر آئی۔ انہوں نے ان خیالات کو خلافِ استعماریت محاذ کی تقویت

کے لئے عمدہ ذریعہ تھا۔ اس طرح اشتراکیت پھیلنا شروع ہوگئی۔

اشتراکی حربے

برسوں تک انڈونیشی کمیونسٹ بغیر پارٹی تشخص کے کام کرتے رہے۔ وہ سوشلسٹ پارٹی میں مارکسی گروہ کی حیثیت سے مصروف کار رہے۔ جنگ آزادی میں بھی شامل تھے۔ اس میں نیشنلسٹ بھی تھے، سوشلسٹ بھی اور کمیونسٹ بھی۔ تحریک آزادی ان سب کا متحدہ محاذ تھا۔ البتہ کمیونسٹ متشدد وطن پرست تھے اور انہوں نے زیادہ توجہ مسلح بغاوت کی طرف مبذول رکھی۔ یہ گوریلے لڑنے والے تھے اور انہوں نے نہایت بے جگری سے گوریلا جنگیں لڑیں اور بڑے نقصانات اٹھائے۔ اس طرح ملک میں بہت ہر دل عزیز ہوگئے۔ ۱۹۴۲ء کے بعد انڈونیشیا میں دیگر ایشیائی ممالک کی طرح جو جاپانی قبضے میں تھے، اشتراکیت متشدد وطن پرستی اور بہادری کی مترادف ہوگئی۔ دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر اور حصول آزادی سے پیشتر، اشتراکی ایک نئی راہ پر گامزن ہوگئے۔ لائحہ عمل کی یہ تبدیلی ۱۹۴۸ء کی مشہور اشتراکی کانفرنس منعقدہ کلکتہ کے بعد واقع ہوئی۔ اس کانفرنس میں جنوب مشرقی ایشیا کے اشتراکی کارکن شامل تھے۔ اس کانفرنس کے بعد ہندوستانی اور برمی اشتراکیوں نے بھی اپنی راہ عمل بدلی تھی۔ اس کے بعد انڈونیشی اشتراکیوں نے "مسلح بغاوت" کے دور کا آغاز کیا وہ سوشلسٹ پارٹی سے کٹ کر اپنی حکومت کے خلاف ہوگئے اور اپنے ہی ہم وطنوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ صدر سوئیکارنو کی حکومت ولندیزی استعمار کے خلاف برسر پیکار تو تھی، اب اسے ملکی اشتراکیوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑا۔ اس مہم میں ملک نے بالعموم حکومت کا ساتھ دیا اور اشتراکیوں کو بہ حیثیت مجموعی غدار کہا جانے لگا۔ اس طرح اشتراکی بدنام ہوگئے اور سابقہ ہر دلعزیزی کھو بیٹھے۔ چنانچہ انہوں نے بہت جلد اپنی غلطی کو محسوس کیا اور پینترا بدل لیا۔ ان کے پیش نظر پروگرام "گڑبڑ پیدا کرنا اور اپنی تنظیم کرنا تھا۔ گو اس سے پیشتر وہ حکومت کے رکن بھی بنتے چلے آئے تھے، اب انہوں نے حکومت سے باہر رہنے کو ترجیح دی۔ وہ موجودہ حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں لیکن اس سے ان کا مقصد حکومت کو امریکہ کی نظروں میں گرانا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ پارلیمان میں ان کی تعداد بائیس ہے۔ حال ہی میں وزیر اعظم کے خلاف جو قرارداد عدم اعتماد پیش ہوئی اس میں انہوں نے وزیر اعظم کا ساتھ دیا۔ گو وہ ساتھ نہ دیتے تو بھی وزیر اعظم کو چار کی اکثریت مل جاتی۔ لیکن اس سے امریکی حلقوں میں یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ جو حکومت کو اشتراکیوں کی مدد حاصل ہے اور اس کے عوض میں حکومت نے اشتراکیوں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ تجارتی اداروں، سرکاری دفاتر حتیٰ کہ فوج تک میں اثر و نفوذ پیدا کریں۔ کمیونسٹ یہ چال چل رہے ہیں کہ امریکی حلقوں میں انڈونیشی حکومت پر خوب تنقید ہو کہ وہ اشتراکیوں کی مدد کرتی ہے تاکہ حکومت کے دل میں اس تنقید سے امریکہ سے بے ہمدردی پیدا ہو سکے۔ چنانچہ یہ قابل غور ہے کہ حال ہی میں برسراقتدار نیشنلسٹ پارٹی کا جو کنونیشن منعقد ہوا اس کا امریکی سفارتی نمائندوں نے مقاطعہ کر دیا اور میدان روس اور چین کے لئے خالی چھوڑ دیا۔

اشتراکی قوت

تنظیمی اعتبار سے اشتراکی زیادہ مضبوط نہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کی تعداد پانچ لاکھ کے برابر ہے۔ یہ مبالغہ ہے۔ البتہ یہ تعداد ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ضرور ہوگی۔ لیکن چین کے بعد سب سے بڑی اشتراکی جماعت انڈونیشیا میں ہے۔ (ایران کی تودہ پارٹی اس سے دوسرے نمبر پر ہے) انڈونیشیا میں چونکہ قومیت اور مذہبیت کے جذبات عام ہیں اس لئے وہ اشتراکیت کے سیل کے سامنے رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ حکومت سرخ چین کی دوست ہے اس لئے اشتراکیوں کو بھی ایک حد تک احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن متفرق نعرے کمیونسٹوں کی واحد اجارہ داری نہیں رہے۔ اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اشتراکی بعد میں وہ بات کرتے ہیں جو پہلے صدر اور وزیر اعظم کہہ چکے ہوتے ہیں۔ اندریں حالات اشتراکیوں کی توجہ تمام تر تجارتی اداروں اور نوجوانوں کی تحریکوں پر مرکوز ہے۔ ان میں اہم ترین SOBSI (انڈونیشیا کی لیبر فیڈریشن) ہے۔ اس میں چالیس ٹریڈ یونین شامل ہیں اور اس کا دائرہ رکنیت ساٹھ لاکھ صنعتی اور زراعتی کارکنوں میں سے ۲۵ لاکھ پر محیط ہے۔ "سابسی" کے تمام لیڈر اشتراکی نہیں، نہ سارے ٹریڈ یونین اشتراکی ہیں۔ لیکن چونکہ صنعت اور زراعت پر زیادہ تر قبضہ غیر ملکیوں کا ہے اس لئے کمیونسٹوں کو بڑا عمدہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ نسلی جذبات ابھار کر انہیں سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کریں۔ ٹرانسپورٹ کے کارکن ان کے قبضے میں ہیں اور وہ جب چاہیں عمومی ہڑتال کر کے مواصلات کو درہم برہم کر سکتے ہیں۔

نوجوانوں میں اشتراکیت کو فروغ دینے کے لئے وہ چینی زیادہ کام آتے ہیں جو انڈونیشیا میں آباد ہو چکے ہیں۔ چینی نوجوانوں کی اکثریت اشتراکی ہوتی جا رہی ہے۔ بیس لاکھ چینیوں میں کوئی پانچ لاکھ لڑکے اور لڑکیاں ہیں وہ پریڈ کرتے ہیں، اشتراکی گیت گاتے ہیں اور چین کی انجمنوں سے اپنا الحاق کر رہے ہیں۔ ان کے والدین اکثر و بیشتر سرخ چین کے مخالفین میں سے ہیں لیکن وہ خود اشتراکی ہوتے جا رہے ہیں۔ انڈونیشی ان نوجوانوں اور ان کی تحریکوں کو غیر ملکی مداخلت کے مترادف سمجھتے ہیں اور اس اعتبار سے انہیں مشتبہ سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان سے مقامی اشتراکیوں کو بھی تقویت پہنچتی ہے۔ اوپر پانچ بڑی سیاسی جماعتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے تین خصوصیت سے اہم ہیں۔ یہ ہیں نیشنلسٹ، مذہبی مجومی اور اشتراکی ان احزاب ثلاثہ کی قدر مشترک یہ ہے کہ تینوں کے پاس کوئی قومی لیڈر نہیں۔ قیادت دراصل صدر سوئیکارنو کے ہاتھ میں ہے اور وہ سارے ملک میں مسلم ہے۔ ان کی مقناطیسی شخصیت اور سحر بیانی کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ عوام ان کی غلطیاں بھول جاتے ہیں اور ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

اس عظیم ملک کی مشکلات تین حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں، یعنی سیاسی، معاشی اور جذباتی۔ لیکن سیاسی اور معاشی توازن کے لئے جذباتی اعتدال شرط اول ہے۔ قائدین ملک کے سامنے یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن وہ کس حد تک اس سے عہدہ برا ہو سکیں گے۔ ان کا جواب مشکل ہے۔ وہ جس محنت سے کام کر رہے ہیں اس کے پیش نظر مستقبل سے عمدہ توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں، ہمدردان انڈونیشیا اس کشمکش کو بڑی گہری دلچسپی سے دیکھتے ہیں اور اس کی کامیابی کے صمیم قلب سے متمنی ہیں۔

(ترجمہ و تلخیص)

مشتہرین کیلئے

طلوع اسلام کثیر تعداد میں شائع ہو کر پاکستان و ہندوستان کے علاوہ غیر ممالک میں ہر طبقہ کے لوگوں کے پاس جاتا ہے۔ اس میں چھپنے والے اشتہارات ہزاروں خریداروں کی نظروں سے گذرتے ہیں۔

نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	فی اشاعت	ایک سو پچاس روپے
نصف صفحہ	"	اسّی روپے

ٹائیٹل کے صفحات

دوسرا صفحہ	پچاس فی صدی زائد
تیسرا صفحہ	پچیس فی صدی زائد
چوتھا صفحہ	پچھتر فی صدی زائد

مزید تفصیلات ناظم ادارہ (شعبۂ اشتہارات) سے حاصل کیجئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ء
کراچی

ماہنامہ طلوع اسلام کے پرانے پرچے

۱۹۳۸ء سے لے کر جنوری ۱۹۵۵ء تک کے بعض پرچے دفتر میں موجود ہیں جو ممبر بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دیئے جائیں گے۔

اس رعایت سے ۳۰ر اپریل تک فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳ء، کراچی

بابُ المراسلات

رہن

راولپنڈی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ:۔

عام طور پر طریقہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے کوئی رقم قرض لیتا ہے تو مقروض اپنی زمین قرض خواہ کے پاس رہن رکھ دیتا ہے۔ اس مرہونہ اراضی کی پیداوار قرض خواہ کو چلی جاتی ہے (اگر اسے مقروض کاشت کرے تو وہ صرف بٹائی کا حقدار ہوتا ہے) سوال یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے اس قسم کی مرہونہ اراضی کی آمدنی کھانا جائز ہے یا نہیں۔

طلوع اسلام:۔ قرآن میں رہن کا ذکر صرف ایک مقام پر آتا ہے۔ سورۂ بقرہ (آیت ۲۸۲) میں تفصیلی احکام دیئے ہیں کہ جب قرض کا لین دین کرو تو اسے ہمیشہ ضبط تحریر میں لاؤ۔ اس کے بعد ہے کہ اگر تم سفر میں ہو اور وہاں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو ایسی صورت میں مقروض کی کوئی چیز بطور ضمانت اپنے قبضہ میں رکھ لو (۲/۲۸۳) بس یہ ہے رہن سے مطلب۔ مرہونہ چیز کی آمدنی کو خود کھا جانا ربٰوا ہی کی ایک دوسری شکل ہے جسے قرآن حرام قرار دیتا ہے۔ ربٰوا کے معنی یہ ہیں کہ آپ کسی کو کچھ روپیہ قرض دے کر اس رقم سے زائد رقم وصول کرلیں۔ یہ رقم آپ نقدی میں وصول کریں یا جنس کی شکل میں (جیسے مرہونہ زمین کی آمدنی) دونوں کی صورت ایک ہی ہے۔

---

(۲) زمیندارہ بینک

مذکورہ صدر مستفسر کا دوسرا سوال یہ ہے کہ:۔

زمیندارہ بینک میں جو لوگ ملازم ہوتے ہیں انہیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ سود کی آمدنی ہی سے ملتی ہے۔ اس تنخواہ کا لینا کیسا ہے۔

طلوع اسلام:۔ ایک زمیندارہ بینک پر ہی کیا موقوف ہے آجکل مختلف بینکوں میں اور دفاتر میں بھی صورت یہ ہے کہ اگر پوری آمدنی نہیں تو آمدنی کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور سود کا ہوتا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس سود کی حیثیت کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک قرآنی معاشرہ میں سود کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ ذاتی قرضوں پر سود نہ بینکوں کا سود۔ لیکن موجودہ اقتصادیات کا سارا نظام غیر قرآنی ہے اور بیشتر کاروبار اس قسم کے سود پر چلتا ہے جسے بینکوں کا سود کہا جاتا ہے۔ اس مسئلہ پر انفرادی طور پر موافق اور مخالف بہت کچھ کہا جا چکا ہے اور کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ سوالات افراد کے حل کرنے کے نہیں بلکہ نظام کے حل کرنے کے ہیں۔ موجودہ حالات میں بینکوں یا دفتروں کے ملازمین کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ اپنی تنخواہوں کو جائز آمدنی تصور کریں۔

(۳) ان ہی صاحب کا تیسرا سوال یہ ہے کہ:۔

بچے کو دودھ کتنے عرصہ تک پلانا چاہیئے۔

طلوع اسلام:۔ قرآن میں رضاعت کی مدت دو سال لکھی ہے (۲/۲۳۳) لیکن یہ مدت ایک قانونی ضرورت کے پورا کرنے کے لئے ہے۔ یعنی طلاق کی صورت میں اگر کوئی شخص چاہے کہ اس کی مطلقہ بیوی بچے کو دودھ پلائے تو اس رضاعت کی مدت دو سال ہے۔ جس کا اسے معاوضہ دینا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ دو سال کی مدت کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ماں اپنے ہر بچے کو ہر حالت میں دو سال تک ضرور دودھ پلائے۔ مختلف صورتوں میں جس طرح اقتضائے حالات کے ماتحت مناسب سمجھا جائے کیا جائے خود اسی آیت (۲/۲۳۳) میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر یہ دونوں میاں بیوی باہمی رضامندی سے چاہیں تو بچہ کا دودھ دو سال سے پہلے بھی چھڑا سکتے ہیں (واضح رہے کہ دوسری جگہ قرآن نے جو حمل اور رضاعت کی مشترکہ مدت کو اڑھائی سال قرار دیا ہے تو اس میں قانونی مقصد کے لئے ایسی صورتوں کو بھی لیا گیا ہے جس میں بچے نو ماہ کے حمل سے پہلے بھی پیدا ہو جاتے ہیں)

---

(۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام

دہران سے ایک صاحب کہتے ہیں کہ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مَیْفٰنَ اکے ساتھ کھلًا آیا ہے (جس کے معنی ادھیڑ عمر کے ہیں) تو بعض لوگ اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ آسمان سے اتر کر اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ یہاں گزاریں گے اور پھر وفات پائیں گے۔ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟

طلوع اسلام:۔ قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمانوں پر چلے جانے اور دوبارہ آنے کا کوئی ذکر نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ، یہودیوں کی سازشانہ تدبیروں سے بچ کر کسی اور طرف ہجرت کرکے چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے عمر کا باقی حصہ گذارا۔ یعنی وہ وہاں کھلًا کی عمر تک پہنچ گئے تھے۔ کسی آنے والے کا تصور —— وہ کوئی پُرانا نبی ہو یا نیا، مسیح ہو یا مہدی، قرآن کی کھلی تعلیم کے خلاف اور ختم نبوت کے نقیض ہے۔ نبی اکرم صلعم آخری نبی اور قرآن آخری کتاب ہے۔ رسول اللہ کے بعد امت مسلمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے اور اس امت کے قرآنی نظام کو اس کتاب کو عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ٹھیرایا گیا ہے۔ مسلمانوں کی توجہ کو ملت اور نظام کے تصور سے ہٹا کر افراد کی طرف منتقل کر دینا عجم کی انہی سازشوں میں سے ایک سازش تھی۔ جس کی رو سے انھوں نے اس امت کو صراط مستقیم سے ہٹا کر دوسری راہوں پر ڈال دیا۔ ان کا دوبارہ صراط مستقیم پر آنا اپنے ہاں قرآنی نظام کو رائج کرنے سے ہوگا نہ کہ کسی مزعومہ آنے والے کے ہاتھوں۔ آنے والوں کا دور رسول اللہ پر ختم ہو گیا۔ (۱۹۵۵ء)

---

(۵) ذی القربیٰ کا مفہوم

ان ہی صاحب نے یہ بھی پوچھا ہے کہ:۔

قرآن نے مال غنیمت کے متعلق لکھا ہے کہ اس کا پانچواں حصہ رسول اور ذی القربیٰ وغیرہ کے لئے ہے (۸/۴۱) تو اگر رسول سے مراد مرکز نظام ملت ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ قرآنی نظام کے صدر یا امیر المؤمنین کے رشتہ داروں کی کفالت بھی بیت المال (خزانۂ عامہ) سے ہوا کرے۔

طلوع اسلام:۔ یہ ظاہر ہے کہ جب امیر ملت کی ضروریات بیت المال سے پوری ہوں گی تو جن افراد کی کفالت اس امیر ملت کے ذمہ تھی ان کی کفالت بھی بیت المال ہی سے ہوگی۔

لیکن یہ چیزیں قرآنی نظام کے ابتدائی اور عبوری دور سے متعلق ہیں۔ جب یہ نظام اپنی آخری اور مکمل شکل میں سامنے آجائے تو اس میں تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا مہیا کرنا نظام کے ذمہ ہو جاتا ہے۔

(۶) روح خداوندی

دہران سے کچھ احباب نے مجھ سے ایک سوال پوچھا ہے جس کا جواب طلوع اسلام کے ذریعہ دیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں نے (تصوف کے ضمن میں) یہ لکھا ہے کہ یہ تصور کہ انسانی روح خدا کی ذات کا ایک حصہ ہے اور زندگی کا منتہیٰ یہ ہے کہ یہ جزو اپنے کل سے پھر جا ملے، غیر قرآنی تصور ہے۔ دوسری طرف میں نے کئی ایک مقامات پر لکھا ہے کہ انسانی انا روح خداوندی ہے۔ اگر یہ روح خداوندی ہے تو پھر تصوف والوں کی یہ بات کس طرح غلط ہے کہ یہ خدا ہی کی ذات کا ایک حصہ ہے؟

جواب:۔ ان حضرات کو یہ مغالطہ اس لئے ہوا ہے کہ انہوں نے ذات خداوندی اور روح خداوندی کو ایک ہی چیز سمجھ لیا ہے۔ روح خداوندی، خدا کی ایک صفت ہے۔ روح کے معنی توانائی کے ہیں یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کا ترجمہ الوہیاتی توانائی یا (DIVINE ENERGY) کیا ہے۔ یہ توانائی خدا کی اس قسم کی صفت ہے جس طرح مثلاً (علم) خدا کی ایک صفت ہے۔ خدا نے اپنے علم میں سے کچھ حصہ انسانوں کو دیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا نے اپنی ذات کا کچھ حصہ انسانوں کو دے دیا ہے۔ اور جب تک یہ حصہ پھر خدا کی ذات میں جا کر نہیں مل جائے گا اس کی ذات نامکمل رہے گی۔ اسی طرح اس اپنی توانائی کا ایک شمہ (من روحہ) انسان کو دیدیا ہے جس سے اس میں اختیار وارادہ کی خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ اسی کو انسانی ذات کہتے ہیں۔ یہ توانائی ایسی ہے کہ اگر قرآنی پروگرام کے مطابق اس کی تربیت کرلی جائے تو یہ موت کے بعد زندگی کی آئندہ منازل طے کرتی ہوئی، آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ روح خداوندی، خدا کی ذات کے کل کا کوئی جزو نہیں۔

(پرویز)

علامہ اسلم جیراجپوری مدظلہ

میرے اکثر احباب نے لکھا ہے کہ علامہ اسلم جیراجپوری کے کوائف حیات تو ان کی خود نوشت سوانح (میرے عہد طالب علمی کے حالات) سے معلوم ہو گئے لیکن یہ کہیں سے معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کے ساتھ میرے روابط کس طرح پیدا ہوئے اور وہ کن مراحل سے گزرے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ فریضہ مجھ پر عائد ہوتا ہے جس کی ادائیگی ضروری ہے۔

میں ان احباب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری توجہ اس فریضہ کی طرف منعطف کرائی جسے میں عہد

بینُ الاقوامی جائزہ

ہفتہ گزشتہ میں بین الاقوامی سیاست کا نقطۂ ماسکہ چین رہا ہے۔ کوئی عجب نہیں کہ چین ہی تا دیر بین الاقوامی توجہات کا مرکز بنا رہے۔ تازہ کوائف میں مشرق بعید نے جنگ کی سی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ گو کسی ایک فریق کے لئے جنگ کی طرح ڈالنا آسان نہیں تاہم جانبین سے جس قسم کے بیانات جاری ہو رہے ہیں اُن میں براہ راست تصادم کا ذکر آنا شروع ہو گیا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، سرخ چین ایک عرصہ سے اس کے لئے کوشاں ہے کہ اقوامِ عالم بالخصوص اقوامِ مغرب اس کی اشتراکی حکومت کو تسلیم کر لیں اور اقوام متحدہ کا رکن بنا لیں۔ امریکہ خصوصیت سے اس کا مخالف ہے۔ اس نے نہ خود سرخ چین کو تسلیم کیا ہے اور نہ اسے اقوام متحدہ ہی میں داخل ہونے دیا ہے۔ دیگر راہیں مسدود دیکھ کر چین نے کوریا کی جنگ میں شرکت کی لیکن اس جنگ کے ذریعہ بھی وہ رکنیت اقوام متحدہ حاصل نہ کر سکا۔ اس کے بعد اس نے ہند چینی کی طرف توجہ دی۔ وہاں بھی اس کا مقصد حل نہ ہو سکا۔ اب اس کی توجہ اپنے حریف نیشنلسٹ چین کو ختم کر دینے کی طرف مرکوز ہو رہی ہے۔ چیانگ کائی شیک چین سے بے دخل ہو کر چند ساحلی جزیروں پر قابض ہے ان میں قابلِ ذکر فارموسا اور پیسکیڈورز ہیں کچھ عرصہ سے ان جزائر پر حملے ہو رہے ہیں۔ تازہ حملوں کا نشانہ تاچن جزیرہ ہے جو ساحل چین سے بالکل قریب ہے۔ اس جزیرے پر سرخ چین کے حملے اتنے شدید ہو گئے ہیں کہ نیشنلسٹ چین تخلیہ تک کی نوبت آ پہنچی ہے۔ بات یہاں تک تو چین اور فارموسا تک محدود رہتی نظر آتی ہے لیکن اس کی زد امریکہ پر پڑتی ہے کیونکہ اس کا ساتواں جنگی بیڑا آبنائے فارموسا میں پڑا ہے اور اس کی طرف سے کئی بار اعلان ہو چکا ہے کہ وہ فارموسا کو حملے سے بچائے گا۔ حال ہی میں ان اعلانات کو ایک معاہدۂ دفاع کی شکل دیدی گئی ہے۔ امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے ان دنوں ایک اور قدم اٹھایا ہے انہوں نے کانگرس سے یہ مطالبہ کیا — اور یہ مطالبہ منظور کر لیا گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو فارموسا کی مدافعت کے لئے امریکی توپیں استعمال کر لی جائیں۔ نظر بہ ظاہر یہ ایک انتہائی اقدام ہے جس کا نتیجہ جنگ ہو سکتا ہے۔ صدر آئزن ہاور نے اس کی منظوری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے امریکہ نے اپنے اس عزم کا اعلان کیا ہے کہ وہ اس علاقے میں جسے وہ اپنے تحفظ کے لئے اہم سمجھتا ہے اشتراکی جارحیت کا پوری طرح مقابلہ کرے گا۔

چین کا جواب

چین نے اسے جارحیت پر محمول کیا ہے اور فارموسا کو چین کا داخلی معاملہ قرار دیتے ہوئے امریکہ کو تنبیہ کیا ہے کہ وہ اس قسم کی داخلی مداخلت سے باز آ جائے۔ چین نے تاچن جزیرے سے متعلق بھی امریکہ کو متنبہ کیا ہے۔ حملوں کی تاب نہ لا کر نیشنلسٹ چین اس جزیرے کو خالی کر رہا ہے۔ تخلیہ کے لئے امریکی بیڑے کی امداد کی ضرورت ہے۔ گو امریکہ نے ابھی تک اس کام کے لئے اپنے جنگی جہاز استعمال نہیں کئے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ ایسا کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ چین کا اعلان یہ ہے کہ نیشنلسٹ چین بڑے شوق سے ان جزائر کو خالی کر سکتا ہے۔ اس میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ لیکن اگر امریکی جنگی جہاز چینی سمندر میں داخل ہوئے تو ان پر حملہ کر دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر چین نے جنگی جہازوں پر حملہ کر دیا تو امریکہ اس کا جواب دے گا۔ کیا ایسا ہو گا؟ اور ہو گا تو کیا اس کا نتیجہ مقامی یا عالمگیر جنگ ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات ہیں جو تمام بین الاقوامی مدبرین کے دل و دماغ پر مستولی ہیں۔

جنگ کا امکان ختم کرنے کے لئے ایک کوشش اقوام متحدہ کے ذریعہ کی جا رہی ہے ۳۱ر جنوری کو سلامتی کونسل کا ایک اجلاس بدیں مقصد منعقد ہوا کہ چین اور فارموسا میں جنگ بند کرائی جائے۔ یہ اجلاس نیوزی لینڈ کی تجویز پر طلب کیا گیا۔ اجلاس شروع ہوتے ہی روس نے اپنی طرف سے ایک تجویز پیش کی جس کا مقصد یہ تھا کہ جارحیت کی طرح امریکہ نے ڈالی ہے لہٰذا اسے مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی تمام افواج اس علاقے سے واپس بلا لے اور چینی معاملات میں دخل اندازی سے دستکش ہو جائے۔ اس کے بعد جنگ بند کر دی جائے تاکہ جو جزیرے سرخ چین کے قبضے میں نہیں ہیں انہیں خالی کرنا آسان ہو جائے۔ روس کی تجویز یہ بھی تھی کہ نیشنلسٹ چین کو ان مباحث میں شریک نہ کیا جائے۔ روس کا مقصد صاف الفاظ میں یہ ہے کہ امریکہ فارموسا کے آس پاس سے اپنی فوجیں نکال لے جائے اور نیشنلسٹ چین تمام متعلقہ جزیرے سرخ چین کے حوالے کر دے۔ ظاہر ہے کہ نہ نیشنلسٹ چین اور نہ امریکہ، کوئی بھی، اس قرارداد سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ بہر حال سلامتی کونسل نے نہ نیوزی لینڈ کی قرارداد پر بحث کی نہ روس کی قرارداد پر۔ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے سرخ چین کو اس بحث میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ روس کی یہ تجویز مسترد کر دی گئی کہ نیشنلسٹ چین کو شریک نہ کیا جائے۔ اس فیصلے سے قدرے امیدیں پیدا ہو گئیں کہ سرخ چین مفاہمت کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اور سلامتی کونسل کی دعوت کو غنیمت سمجھے گا۔ لیکن چینی وزیر اعظم کے جواب نے تمام متعلقہ ممالک میں مایوسی کی لہر دوڑا دی ہے۔ دعوت شرکت کو مسترد کرتے ہوئے چو این لائی نے کہا کہ وہ نیوزی لینڈ کی تجویز پر بحث میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں۔ البتہ اگر روس کی تجویز جس میں امریکہ پر جارحیت کا الزام لگایا گیا ہے، پر بحث کی جائے تو چین اپنا نمائندہ شرکت کے لئے بھیجنے پر رضامند ہو جائے گا۔ اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ نیشنلسٹ چین کو سلامتی کونسل سے نکال دیا جائے۔ التوائے جنگ کی کوشش کرنے والوں کے نزدیک یہ جواب مایوس کن ہے۔ خود برطانیہ جو ان مساعی میں پیش پیش ہے، وہاں بھی اس کا ردعمل ایسا ہی ہوا ہے۔ "ٹائمز" اخبار کے الفاظ میں چین نے مفاہمت کا دروازہ بڑے زور سے بند کر دیا ہے۔ — وزیر خارجہ، ایڈن نے تازہ بیان میں کہا ہے کہ اگر چین نے زبردستی متعلقہ جزائر پر قبضہ کرنا چاہا تو اس سے "امن و سلامتی" خطرے میں پڑ جائیں گے اور یہ عالمی مسئلہ بن جائے گا۔ یہ بیان اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر چین نے علم جوئی سے کام نہ لیا تو برطانیہ کی ہمدردی کھو بیٹھے گا۔

امید و یاس

کیا چین کا انکار قطعی ہے اور اس سے لاینحل تعطل پیدا ہو جائے گا؟ اس کا جواب وثوق سے نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ایسے آثار ہیں جن سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ بظاہر متشدد اور غیر مصالحانہ روش تبدیل ہو جائے گی۔ امریکہ کی روش سخت ضرور ہے لیکن اس کی کوشش یہ ہے کہ فارموسا کا معاملہ اقوام متحدہ کے ذریعہ حل ہو۔ اس سے یہ امید پیدا ہو جاتی ہے کہ امریکہ کوئی عاجلانہ کارروائی نہیں کرے گا۔ چین کے استرداد سے بھی بعض حلقوں میں امید افزا استنباط کیا جا رہا ہے، چین نے ایک طرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ نیشنلسٹ چین کو سلامتی کونسل سے نکال دیا جائے اور دوسری طرف امریکہ کو یقین دلایا ہے کہ وہ بین الاقوامی کشیدگی کم کرنے کے لئے جو کچھ بھی خلوص نیت سے کریگا چین اس سے تعاون کا ثبوت دے گا۔ کیا اس کا یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ چین ایک ایسی بین الاقوامی کانفرنس کا تصور کر رہا ہے جس میں اس کا حریف شامل نہ ہو؟ ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو۔ چنانچہ اس غیر مذکور متبادل تجویز پر بھی غور کیا جانے لگا ہے۔

اس کی کیا شکل ہو گی؟ اس کے جواب کے لئے توجہ دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کی کانفرنس کی طرف مبذول کرنا ہو گی۔ چونکہ برطانیہ التوائے جنگ کے لئے خصوصیت سے کوشاں تھا، اس لئے جب دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم لندن میں جمع ہوئے تو اس کے نمائندوں کو تبادلہ خیالات کا بہتر موقع میسر آ گیا۔ خاص طور پر اس لئے کہ ان وزرائے اعظم میں پنڈت نہرو بھی تھے جو پچھلے دنوں وزیر اعظم چین سے مل بھی آئے ہیں۔ اور لندن روانہ ہونے سے پیشتر دہلی میں چینی سفیر نے انہیں ایک یادداشت بھی پیش کی تھی۔ گویا دولت مشترکہ میں وہی چینی مقاصد کی ترجمانی کر سکتے تھے۔ پنڈت نہرو نے بھانپا کہ وہ اقوام متحدہ میں چنداں مؤثر نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ یہ قضیہ اقوام متحدہ سے باہر ہی طے کیا جائے اور کولمبو ممالک کی وساطت سے، نیز یہ بھی کہ سرخ چین، امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور ہندوستان کی ایک کانفرنس کسی مناسب مقام پر، مثلاً دہلی میں، طلب کی جائے۔ ایسی کانفرنس کے لئے باقاعدہ طور پر کوشش بھی شروع ہو گئی۔ یہ کوشش وزیر اعظم انڈونیشیا کی طرف سے تھی۔ لندن میں انڈونیشی سفارتخانے سے یہ اعلان کیا گیا کہ انڈونیشی کابینہ نے وزیر اعظم کو اختیار دیا ہے کہ وہ کولمبو ممالک سے مل کر فارموسا

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

نقد و نظر

افکارِ معرّی

ابو العلاء معرّی چوتھی صدی ہجری کا ایک بلند پایہ شاعر ہے۔ بڑا بیباک نقاد اور آزاد خیال مفکر۔ بچپن ہی میں آنکھوں سے معذور ہو گیا، لیکن بصارت کے گم ہو جانے سے بصیرت اس قدر چمکی کہ اس نے زندگی کے مختلف گوشوں میں وہ کچھ دیکھا جو آنکھوں والوں کو بھی بہت کم نظر آتا ہے۔ دیکھا اور اسے اس حسن و توانائی سے دنیا کے سامنے پیش کیا کہ شاعری اور زبان اس پر بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے مقابلہ میں فارسی زبان میں غالب کو پیش کیا جا سکتا ہے (اگرچہ غالب کی شخصیت اس سے زیادہ اونچی نظر آتی ہے) اللزومیات معرّی کا جامع دیوان ہے جس کا انتخاب بیروت یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے شائع کیا تھا۔ اس انتخاب کا اُردو (نثر میں) ترجمہ عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے کیا ہے اور اسے ادارۂ فروغ تعلیم وسن پورہ لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کی ضخامت ۱۶۰ صفحات ہے اور قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

معرّی مشکل پسند اور دشوار گو ہے۔ اس لئے اس کے اشعار کا ترجمہ آسان نہیں تھا۔ لیکن طاہر صاحب نے عربی ادب کا ذوق اپنے والد (مولانا سورتی مرحوم) سے ورثہ میں پایا ہے۔ اس لئے ترجمہ میں روانی اور شگفتگی ہے۔

شاعر اپنے ماحول کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے۔ اس لئے معرّی کے کلام میں ہمیں عہدِ عباسیہ کے معاشرہ کی تصویر کے نمایاں خط و خال مل جاتے ہیں۔ یعنی وہ معاشرہ جس میں انسانیت سلطانی و ملائی و پیری اور سرمایہ داری کے بوجھ کے نیچے کچلی جا رہی ہو۔ معرّی کے سامنے ایسے ہی انسان تھے جن سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ

> لوگ جو تھوڑی بہت بھلائی کرتے ہیں وہ تکلفاً ہوتی ہے لیکن جس قدر شر ان سے سرزد ہوتا ہے وہ طبیعت کی پکار ہوتی ہے۔
>
> ہمیں ملامت مت کرو۔ ہم میں سے ہر ایک کمین زادہ ہے۔ اگر پودہ ہی خراب ہو تو کیا پھل لگ سکتا ہے۔

وہ دین داروں کو دیکھ کر کہتا ہے!

> ہمارا دین تو اب صرف ریاکاری رہ گیا ہے۔
>
> اے دنیا کے دون! ہمیں تو تیرے نمازیوں میں کوئی بھی تقویٰ شعار نظر نہیں آتا۔

وہ واعظ کے متعلق کہتا ہے۔

> اے بھلے مانس ذرا تھم جا!
>
> تو عورتوں میں وعظ کرنے والے مُلّا کی چال میں آ گیا۔
>
> جو صبح کو تمہارے لئے شراب حرام کرتا ہے۔
>
> اور شام کو قصداً اسے نوش کرتا ہے۔
>
> تمہارے پاس آ کر وہ بیان کرتا ہے کہ میرے پاس اوڑھنے کی چادر تک نہیں ہے۔ حالانکہ وہ اپنی تفریحوں اور عیاشیوں میں اپنی چادر گروی رکھ آیا ہے۔

وہ اس دور کے متصوفانہ تقویٰ کے متعلق کہتا ہے کہ

> اگر عاجزی، بے بسی اور حماقت کا نام تقویٰ ہے تو ذلت پر قانع گدھے اول درجے کے متقی ہیں۔

وہ اپنے دور کی سیاستِ ملوک کا نوحہ خواں ہے اور چیخ کر کہتا ہے کہ

> بادشاہوں نے مے نوشی اور رقص و سرود کی محفلوں کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور بڑے بڑے افسر ٹیکس جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

معرّی، سب سے زیادہ نالاں اپنی سوسائٹی کی عورتوں سے ہے جو قدرتی حسن پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ مصنوعی غازے اور مہندی سے بن سنور کر نکلتی ہیں۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی سربمہر بوتلیں کھول دی گئی ہیں۔ وہ اُن سے اس قدر تنگ ہے کہ چلا کر پکار اٹھتا ہے کہ

> اگر عورت نہ بنائی جاتی تو انسانی سعادت کی ابتدا ہو جاتی۔

وہ دین کے متعلق کہتا ہے کہ

> ہمارے آبا و اجداد نے اپنے اسلاف کے طریقے پر زندگیاں گذار دیں۔
>
> اور ان کی تقلید کرتے ہوئے جو دین اُن سے پایا
>
> وہ ہمارے سر تھوپ دیا۔
>
> یہی وجہ ہے کہ جو کچھ کہا سنا جاتا ہے
>
> اس پر کوئی فکر نہیں کی جاتی۔
>
> اور حد تو یہ ہے کہ حماقت کی وجہ سے یہ بھی نہیں سوچا جاتا
>
> کہ اپنا سر کس کے قدموں پر ڈال رکھا ہے؟

روایات کے متعلق کہتا ہے:۔

> یہ دنیا خود اپنے فرزندوں کو کس قدر دھوکا دیتی ہے۔
>
> اس پر لوگوں کا روایات و احادیث میں جھوٹ شامل کرنا
>
> میرے اسبابِ پریشانی میں مزید اضافہ ہے۔

ہمارے سلاطین جس طرح ہزارہا کی تعداد میں لونڈیاں اپنے حرم میں داخل کرتے اور اس کے جواز میں جس طرح احادیث وضع کر لی جاتیں، اس کے متعلق معرّی لکھتا ہے:۔

> پیغمبر کی طرف منسوب احکام کے علاوہ کونسی دلیل ہے
>
> جس نے عربوں کے لئے
>
> دیگر اقوام کی عورتوں کو جس طرح بھی ہو سکے حلال کر دیا؟

سرمایہ داری اور مذہب کے گٹھ جوڑ کے متعلق کہتا ہے:۔

> یہ مذاہب تو دنیا کو سرمایہ داروں کی طرف کھینچنے کے پھندے ہیں۔
>
> یہ تو ہے جہاں تک بنے لوگوں سے کٹ۔

یہ ہیں اس معاشرہ کے چند خطوط جن کا نقشہ ہمیں معرّی کے کلام میں ملتا ہے۔ یاد رکھئے کہ یہ کسی ایسے شخص کے خیالات نہیں ہیں جو اخلاقی پابندیوں کے توڑنے میں لذت لیتا ہو۔ وہ شراب سے سخت پرہیز کرتا ہے۔ گوشت، انڈے، حتیٰ کہ شہد اور دودھ تک کے استعمال کو بھی دوسروں کے حقوق میں دست اندازی خیال کرتا ہے۔ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے اختلاط کا سخت مخالف ہے۔ حتیٰ کہ اس کے لئے شادی کی ذمہ داری بھی بارِ گراں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ معرّی اپنے خیالات میں انتہا پسند ہے لیکن اس انتہا پسندی کو اگر اعتدال تک بھی لے آئیں تو بھی یہ حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ ہماری تاریخ کا وہ دور جس میں ہمارا معاشرہ قرآنی خطوط پر قائم نہیں رہا تھا اس کا نقشہ ہمارے موجودہ دور سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ معرّی کا مطالعہ اسی نگاہ سے کرنا چاہیئے نہ کہ اسے کوئی معلم یا مصلح سمجھ کر۔ کتاب بڑی دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔

چھوٹی تقطیع۔ ایک سو ساٹھ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے۔

ایجنٹوں کے نام

ہر مہینے کے پہلے ہفتہ میں پرچے بذریعہ وی پی بھیجے جایا کریں گے اور مہینے بھر کے پرچوں کی قیمت وصول کر لی جائے گی۔ باقی تین ہفتوں کے پرچے عام ڈاک سے پوسٹل سرٹیفکٹ لے کر ارسال کئے جایا کریں گے۔ رجسٹری منگوانے کی صورت میں خرچ بذمہ ایجنٹ ہوگا۔

کمیشن

۲ سے دس پرچوں تک کے لئے	=	۲۰ فی صدی
۱۱ سے بیس " "	=	۲۵ فی صدی
۲۱ سے ساٹھ " "	=	۳۳ فی صدی
۶۰ سے زائد "	=	۴۰ فی صدی

حقائق و عبر

لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار پرچہ نکلتا ہے صدق - اس کے مدیر ہیں عبدالماجد صاحب دریابادی - انہوں نے قرآن کی تفسیر بھی لکھی ہے - اس پرچہ کی ۱۴ر جنوری ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں پہلے ہی صفحہ پر "سچی باتیں" کے عنوان سے ذیل کا شذرہ سامنے آتا ہے -

۱۹۳۷ء کا بھی کوئی زمانہ ہوا ہے، ابھی کل کی بات ہے - بنوت یا عہد خلافت راشدہ کا ذکر نہیں - اسی ۱۹۳۷ء کی بات ہے، کہ سرحد کے فقیر ایپی کی سرکوبی کے لئے سرکار برطانیہ نے وزیرستان پر فوج کشی کی - سرکاری فوج ظفر موج چالیس ہزار سے اوپر اور بہتر سے بہتر آلات جنگ سے لیس ادھر مسعودیوں کی تعداد ۲۰۰ سے بھی کم اور اسلحہ جنگ کے نام سے لے دے کے کل ایک رائفل! —— بیانات کو افسانوی یا مبالغہ آمیز نہ سمجھئے - راوی ایک ذمہ دار فوجی افسر ہیں جو خود اس انگریزی مہم میں شریک تھے اور اس وقت پاکستان کی فوج میں میجر جنرل ہیں - اور اور دوسرے جنگی خطابات سے سرفراز —— برطانوی افسر اعلیٰ نے ازراہ ترحم حریف کے پاس کہلا بھیجا کہ اب بھی موقع ہے ہتھیار رکھ دو ورنہ تمہاری قیام گاہ جو ایک پہاڑ میں ہے، تباہ و برباد کر کے رکھدی جائے گی - فقیر کا جواب آیا کہ

"میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے - میں مقابلہ آخری دم تک کروں گا"

جواب جنگی کونسل کے سامنے پیش ہوا - چھوٹے بڑے افسر سب بے اختیار ہنس پڑے —— شاید بات تھی ہی ہنسی کے قابل —— مئی کا مہینہ تھا، اور انگریزی سپاہ کا پڑاؤ میدان شام میں تھا، جو شام نالے کے بہاؤ کی زمین ہے - بارش اس علاقہ میں جلد سے جلد بھی شروع ہوتی ہے - تو جولائی کے اخیر ہفتہ میں - مئی میں اس سرزمین پر بارش کا کوئی احتمال ہی نہ تھا -

---

اب سنئے کہ ادھر ہنسنے والے جنرل اور کرنل احکام پاکر جنگی کونسل سے اپنے اپنے خیمہ کو لوٹ ہی رہے تھے - کہ یکایک گرجتا ہوا بادل آسمان پر نمودار ہوا - سب خوش ہوئے کہ مئی کے شدید موسم میں خوشگواری پیدا ہو جائے گی - دیکھتے ہی دیکھتے اولے پڑنے لگے - لوگ اب بھی خوش تھے کہ ژالہ باری نے شدت اختیار کرلی - اور سارے پہاڑ جیسے سفید چادر سے ڈھک گئے - اب بھی خیر تھی، اتنے میں بارش اتنی تیز آئی، کہ سارے اولے بہہ کر ایک ٹیلے کی صورت میں انگریزی کیمپ کی طرف بڑھے، اور نشیبی خیموں کو پانی کا ریلا اپنے ساتھ بہالے گیا! پھر کیا ہوا؟ ذمہ دار اور چشم دید گواہ کی زبانی سے سنئے :-

"یہی نہیں کہ اس طوفان و سیلاب سے فوج کو نقصان پہنچا اور حرب و ضرب سے لے کر رسد تک کا سامان ضائع ہوا - بلکہ بہت سا سامان بہہ کر فقیر ایپی کے کیمپ کی طرف چلا گیا جو دریا کے بہاؤ کی جانب تھا، اور قبائلیوں کے ہاتھ آیا"

(حدیث دفاع —— از میجر جنرل محمد اکبر خاں - صفحہ ۱۵۲)

کہیئے، قرآن مجید نے مشرکوں کے فوج کی تباہی جس طرح بیان کی ہے، اس پر آپ کا ایمان تازہ ہوا؟ اور اس کا یقین آیا یا نہیں کہ طیراً ابابیل والا خدا ئے کارساز آج بھی معطل نہیں - اسی طرح زندہ و فعال ہے؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ دریابادی صاحب کے نزدیک یہ بارش اور اولوں کا طوفان کس مقصد کے لئے آیا تھا؟ یہ طوفان یہ ثابت کرنے کے لئے آیا تھا کہ "طیراً ابابیل والا خدائے کارساز آج بھی معطل نہیں - آج بھی اگر کوئی فقیر یہ کہدے کہ میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے" تو وہ آپ کی مدد کے لئے سیلاب بھیج دیتا ہے؟ لیکن اگر کوئی اِن مفسر صاحب سے یہ پوچھ بیٹھے کہ حضرت دور کی باتیں تو جانے دیجئے، جب ہلاکو خاں نے دار الخلافت بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی ہے اور خود خلیفۃ المسلمین کو اس بیدردی سے قتل کیا ہے، تو اس وقت ابابیلوں والے خدا نے کیوں مدد نہ کی؟ جب انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی آخری سلطنت کو اس بُری طرح سے ملیا میٹ کیا ہے، تو اس وقت کوئی طوفان کیوں نہ بھیجا گیا؟ جب بالاکوٹ کے میدان میں حضرت سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید اور رفقا ہم (علیہم الرحمۃ) کو سکھوں نے اس بیدردی سے تہ تیغ کیا ہے تو اس وقت آسمان سے اولے کیوں نہ برسے؟ جب ترکی میں مسلمانوں کے آخری خلیفہ کو اتنی بڑی بڑی شکستیں ملی ہیں تو اس وقت اس قسم کی کوئی آسمانی مدد کیوں نہ پہنچی؟ جب خود انہی سرحدی قبائل پر یہی انگریز اس قدر بمباری کیا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان بھی تڑپ اٹھتے تھے تو اس وقت ان بمبار جہازوں کو آندھی اور جھکڑوں سے تباہ و برباد کیوں نہ کر دیا جاتا تھا؟ خود آجکل مسلمانوں کے کئی ملکوں (مثلاً مراکش وغیرہ) میں بے گناہ آبادی کو جس قسم کے مظالم کا تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے، اُس پر آسمان سے بجلیاں کیوں نہیں گرا دیتیں؟ تو ان کے پاس اس کا کیا جواب ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو جس قدر نقصان اس کے ان نادان دوستوں نے پہنچایا ہے، اس قدر نقصان دشمنوں نے بھی نہیں پہنچایا - ان لوگوں کی عمر بھر کوشش یہ رہی ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی طرح توہم پرستیوں میں مبتلا رکھا جائے اور انہیں زندگی کے حقائق کا سامنا کرنا کبھی نہ سکھایا جائے - یہ اُس رسول اکرم و اعظم کا نام لینے والوں کا حال ہے جن کی کیفیت یہ تھی کہ جب اُن کے ایک بچے کی وفات پر سورج کو گرہن لگ گیا اور قبائل عرب جوق در جوق خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے کہ ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ واقعی خدا کے سچے رسول ہیں، تو آپ نے نہایت واضح الفاظ میں فرمادیا کہ چاند اور سورج کو گرہن فطرت کے اٹل قوانین کے مطابق لگتا ہے، اسے کسی کی موت یا پیدائش سے کچھ تعلق نہیں ہوتا - اور اس طرح بتادیا کہ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ (۱۲/۱۰۸) میری دعوت الی اللہ علیٰ وجہ البصیرت ہے - توہم پرستیوں اور نگاہ فریبیوں کے عنکبوتی سہاروں پر نہیں اور اس کے ساتھ ہی اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ کا ٹکڑا بڑھا کر یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ طریقہ صرف میرا ہی نہیں بلکہ جو میرے متبعین ہوں گے اُن کی بھی یہی روش ہوگی!

یہ تھا جو رسول اکرم صلعم نے کیا اور کہا - اور یہ ہیں اُن کے "متبعین" جن کی حالت یہ ہے کہ پہلے "طیراً ابابیل" کے سیدھے سادے واقعہ کو ایک چیستان بنایا اور پھر اسکی سند پر اس قسم کی توہم پرستیوں کی عمارتیں استوار کرتے چلے گئے اور ان کا نام رکھا "سچی باتیں"!

مطبوعات طلوع اسلام کی شرائط ایجنسی

۱- شرح کمیشن
معراج انسانیت ...... ۲۵ فی صدی - دیگر مطبوعات ...... ۳۳ فی صدی
(۲) قیمت بعد وضع کمیشن بذریعہ وی - پی وصول کی جائیگی - (۳) غیر فروخت شدہ کتب واپس نہیں لی جائیں گی - (۴) پہلی فرمائش پچاس روپے (بعد وضع کمیشن) سے کم کی نہیں ہونی چاہیے (۵) ہر آرڈر کے ہمراہ کم سے کم چوتھائی رقم پیشگی آنی چاہیے - ورنہ تعمیل نہیں ہو سکے گی -
نوٹ:- کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر طلوع اسلام سے شرائط طے کریں -

مجلس اقبال (صفحہ ۹ سے آگے)

کوئی " دماغ یافتہ " فلسفیانہ نظام جو دافعات متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہو سکتا ہو؛ انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ بس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیات عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں۔

یہ ہے مختصر خاکہ اس مسئلے کی تاریخ کا جو اس نظم کا موضوع ہے۔ میں نے اس دقیق مسئلے کو فلسفیانہ دلائل کی پیچیدگیوں سے آزاد کر کے تخیل کے رنگ میں رنگین کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ اس حقیقت کو سمجھنے اور غور کرنے میں آسانی پیدا ہو۔ اس دیباچے سے اس نظم کی تفسیر مقصود نہیں محض ان لوگوں کو نشان راہ بتانا مقصود ہے جو پہلے سے اس عسیر الفہم حقیقت کی دقتوں سے آشنا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سطور بالا سے کسی حد تک یہ مطلب نکل آئے گا۔ شاعرانہ پہلو سے اس نظم کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ بقائے حیات آنا کی انفرادی حیثیت اس کے اثبات، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے یہ نکتہ مسئلہ حیات مابعد الموت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے بطور ایک تمہید کے کام دے گا۔

ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساس نفس یا تعین ذات ہے۔ مرکب لفظ بیخودی میں بھی اس کا یہی مفہوم ہے۔ اور غالبًا محسن تاثیر کے اس شعر میں بھی لفظ خودی کے یہی معنی ہیں ؎

" غرق تلزم وحدت دم ازخودی نزنند
بود محال کشیدن میان آب نفس "

" عورت کا قرآن " (صفحہ ۱ سے آگے)

جن پر تمہارے نقصان کی بات بہت گراں گزرتی ہے جو تمہارے فائدہ کے بڑے ہی خواہشمند رہتے ہیں اور مومنوں کے لئے تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔

قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُورِ (یونس ۲)

تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو سر تا سر نصیحت ہے اور اندرونی امراض کے لئے شفا ہے۔

بجز دین اسلام " کی کتاب " قرآن مجید " کے سارے مذاہب عالم میں، کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں ہے جس میں عورت کی کمزوری، بے بسی، بدحالی اور کس مپرسی کا کچھ بھی پاس اور لحاظ کر کے اس کے کچھ حقوق متعین کئے ہوں یا کم از کم اسے " انسان " ہی سمجھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ " قرآن مجید " تنہا کتاب الہٰی ہے جس میں " عورت " کو بھی برابر کا " انسان " سمجھا اور تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے حقوق بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ مگر کتاب ضخیم ہے اور اس میں کسی نسوانی مسئلہ کے تلاش کرنے یا اس کے احاطہ کے لئے محنت درکار ہے۔ اس پر مزید یہ کہ " مسلمان عورت " تعلیم سے بے بہرہ ہے اور کتاب " عربی " زبان میں ہے۔ لہٰذا " مسلمان عورت " قرآنی تعلیمات سے بے خبر اور احکام الہٰی کو، قرار واقعی جاننے سے قاصر و معذور ہے۔

" بین الاقوامی جائزہ " (صفحہ ۱۵ سے آگے)

سے متعلق کشیدگی کم کرنے کی کوشش کریں۔ پنڈت نہرو نے بھی اس ضمن میں ملاقاتیں کیں اور ان سے لندنی سفارت خانہ چین اور چینی وزیر اعظم کا رابطہ بھی قائم رہا۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت مشترکہ کی کانفرنس میں اس تجویز کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی۔ برطانیہ کا رویہ یہ ہے کہ چین کے جواب کے بعد کچھ عرصہ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد اگلا قدم اٹھایا جائے۔ مزید برآں سیلونی وزیر اعظم نے انڈونیشی وزیر اعظم کو مشورہ دیا ہے کہ کولمبو ممالک کی مجوزہ کانفرنس کا موزوں موقع نہیں آیا۔ لندن سے آمدہ اطلاعات سے مترشح ہوتا ہے کہ انڈونیشی تجویز پس پشت ڈال دی جائے گی، گو دولت مشترکہ کانفرنس ہنوز فارموسا پر غور کر رہی ہے۔ اس اثنا میں ایک اور کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں برطانیہ، کینیڈا اور ہندوستان شریک ہوں گے۔ اس میں فارموسا پر تفصیلی بحث کی جائے گی۔ اس کانفرنس کا انعقاد اور اس میں کینیڈا کی شرکت خالی از علت نہیں۔ گو ہندوستان کو چین کا ترجمان سمجھا جاتا ہے اس کے مقاصد سے متعلق عمومی بداعتمادی پائی جاتی ہے۔ تنہا امریکہ کے معاملہ میں امریکہ ہندوستان کو معتمد نہیں سمجھتا۔

مطبوعات طلوع اسلام

معراج انسانیت از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریبًا نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ، مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش قیمت بیس روپے۔

ابلیس و آدم از پرویز۔ سلسلہ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، قصۂ آدم، ابلیس، جنات، ملائکہ، وحی، وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۲۷۰ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۳۲۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۴۰ صفحات قیمت دو روپے

سلیم کے نام از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۲۵ صفحات قیمت چھ روپے

قرآنی فیصلے روزمرہ کی زندگی کے تقریبًا ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسباب زوال امت (از پرویز) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

جشن نامے ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دور آزادی کی سچی بولتی تاریخ۔ ۲۵۷ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

مزاج شناس رسول یہ کون بتلائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول؟ مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۴۴۸ صفحات قیمت چار روپے

مقام حدیث حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریبًا چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

فردوس گم گشتہ از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف قریبًا چار سو صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات ۔ از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت ۔ (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں صفحات ۱۹۲ قیمت دو روپے

نوٹ :- تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ **ادارۂ طلوع اسلام - پوسٹ بکس ۴۳۱۳ - کراچی**

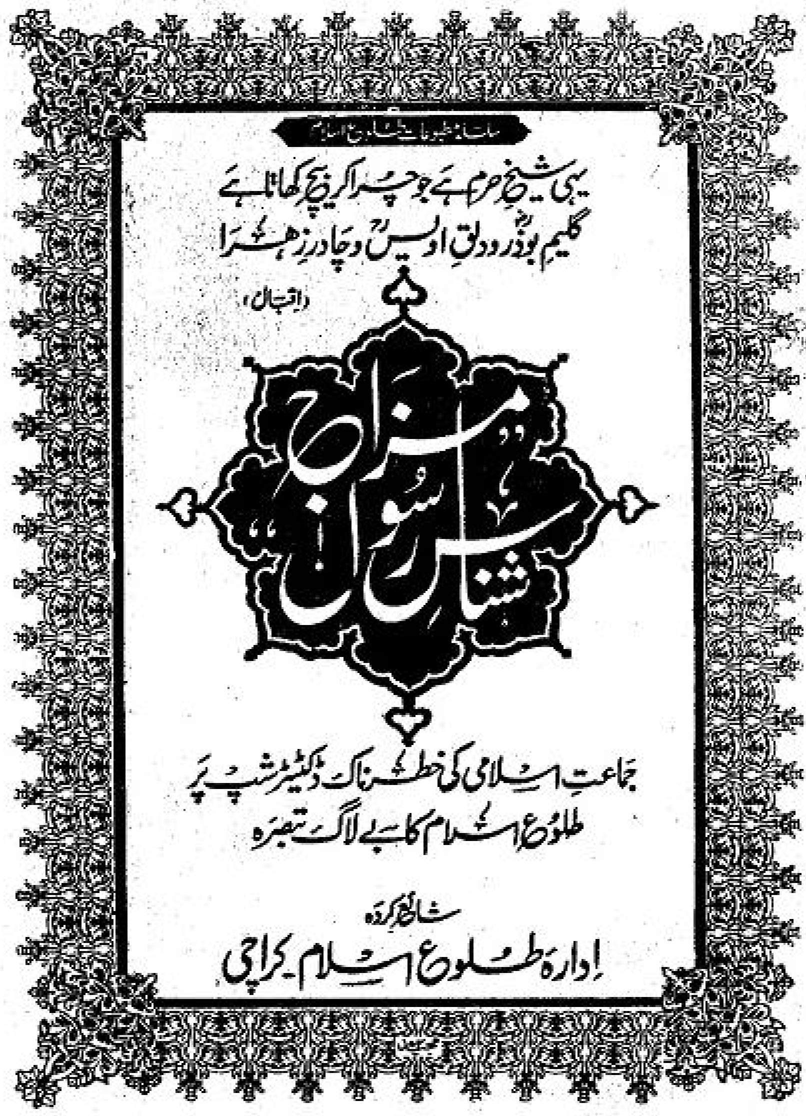

ضخامت ۴۴۸ صفحات ۔ مجلد مع گرد پوش ۔
قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

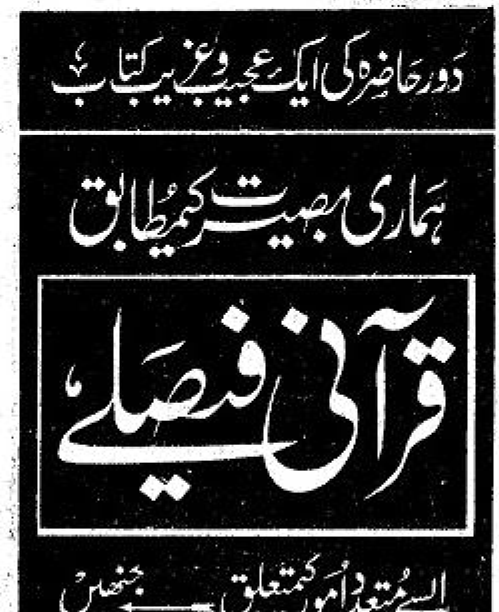

ضخامت ۴۰۸ صفحات ۔ مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

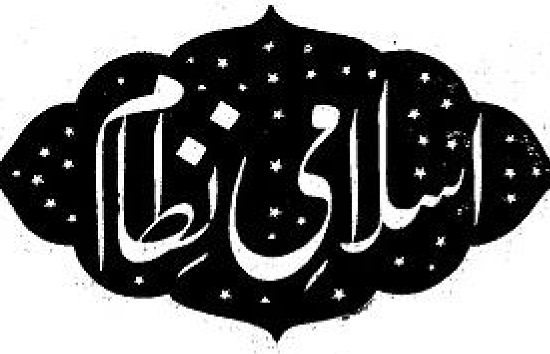

قیمت -/۲ روپے

قیمت -/۸/۱ روپیہ

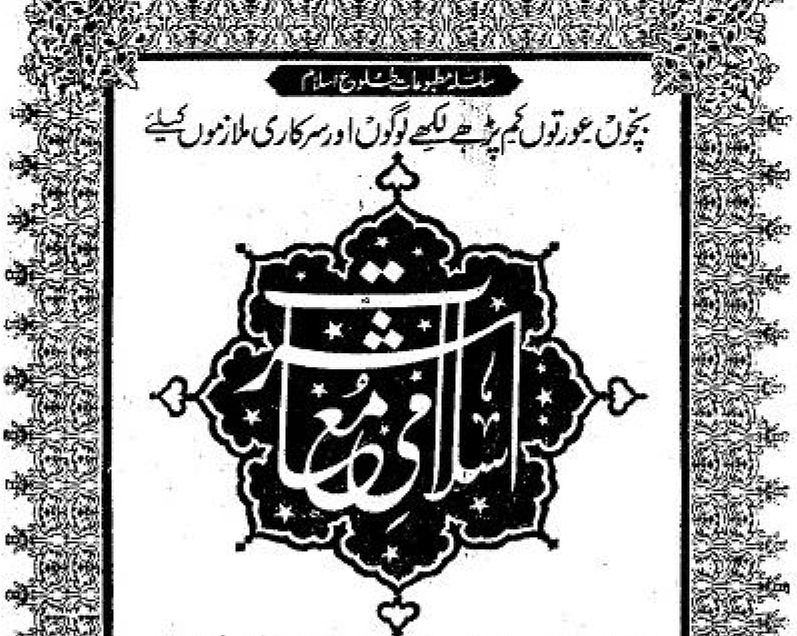

ضخامت ۱۹۲ صفحات ۔ مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳ ۔ کراچی

سلسلہ معارف القرآن

ایں کتاب از آسمانے دیگر است

ابلیس و آدم

جن میں

انسانی تخلیق نظریۂ ارتقا قصہ آدم ابلیس شیطان جنات
ملائکہ اور وحی و رسالت کے متعلق تفصیلی مباحث شامل ہیں۔
ایسے اہم عنوانات۔ قرآنی ارشادات۔ اور جناب پرویز کا قلم۔
عقل و عشق کا ایسا حسین امتزاج شاید ہی کہیں اور ملے۔

شائع کردہ ادارہ طلوع اسلام کراچی

مجلد ۵ر

Only Title Printed at Mueid Art Press, Thathai Compound, Bunder Road, Karachi, and Text at Adabi Press, Robson Road, Karachi, [illegible] Tulu-e-Islam Office 93/1, Fowler Lines, Napier Barracks, Karachi.— Editor Khurshid Alam.